[illegible]

میرا مذہب

محمد علی رُدولوی

ادارہ تحقیقات اُردو پٹنہ

(ولا تکونوا من المشرکین) من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا

کل حزب بما لدیھم فرحون ۝ (الروم)

میرا مذہب

محمد علی ردولوی

تقسیم کار: • مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

صدر دفتر:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علیگڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

اشاعت : ۱۹۹۲ء

قیمت : تیس روپے

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

حرفے چند

وہ عہد کتنا جی دار تھا جب ہمارے پیش رو اپنی ذاتی فکر کو بلا تقیہ بڑی رسانیت سے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے؛ اور پڑھنے والے اتفاق کرتے یا اختلاف، لیکن خلوص فکر کے منکر کبھی نہ ہوتے تھے، قدر دانی کرتے تھے، اور مانیں یا نہ مانیں، عظمتِ فکر کو سر پر بٹھلاتے تھے۔

پیش نظر کتاب اس دور کی ایک یادگار ہے جب لوگ صرف مخالفت کے عادی نہ تھے، شرافت کے ساتھ اختلاف کرنا بھی جانتے تھے۔

ـــــــ مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے غریب دیباچے تجھ کو کون پڑھے گا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جو شخص کسی موضوع پر حاوی نہ ہو، اس کا کتاب لکھنا ظلم ہے۔ زبان سے غلط بات نکالنا بھی ظلم ہے۔ مگر لکھنے میں تو یہ غضب ہے کہ "نوشتہ بماند سیہ بر سپید" ؎

گر گورکمر بہ باغبانی بندد   اوراچہ زیاں برگل و ریحاں ستم است

خالی ڈھارس اسی خیال سے ہوتی ہے کہ اس بھیڑ میدان میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے جیسے نہ معلوم کتنے ہوں گے۔ یہ تو میں اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جو واقعی عذرات اس رسالہ کے لکھنے کے میرے پاس ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ یہ کسی کو تعلیم دینے کے لیے نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ تو ایک اعتراف ہے جو ایک گنہگار اپنے پروردگار اور اس کے بندگان نیکوکار کے آگے کر رہا ہے اپنے خالق سے دعا ہے کہ مجھے معاف کرے اور ہدایت فرمائے اور مخلوق سے استدعا ہے کہ پڑھ کر عبرت کرے اور میرے لیے دعا و استغفار فرمائے۔

www.taemeernews.com

دل میں ایک چھپی ہوئی خواہش یہ بھی تھی کہ کاش اس رسالہ سے "واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا" کی بھی صورت بندھ جاتی۔ مگر افسوس یہ سعادت میری تقدیر میں نہ تھی۔ اس چیز کا خواب میں ہمیشہ دیکھا کیا تھا۔ اور اصل غرض اس رسالہ کی بھی یہی تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ بغیر کھرونچے لگائے اپنی بات دوسروں کے سامنے رکھ دوں مگر افسوس صد افسوس یہ کمال مجھے ودیعت ہی نہیں ہوا تھا ۔

جی میں جو آئے کیجیو پیارے
ایک ہونا نہ در پئے آزار

یہ شرف خدا کے نیک بندوں کو عطا ہوتا ہے۔ ہم ایسے گئے گذرے بندوں کے لیے نہیں۔ پھر بھی اگر پڑھنے والے میرے انداز بیان پر غور کم کریں اور میرے منشاء کو ڈھونڈھنے پر زیادہ زور دیں تو شاید کچھ یگانوں کی بیگانگی کم ہو جائے۔ گو اسلام کا تفرقہ رونے کا مقام ہے۔ مگر ان گئے حالوں پر بھی کچھ باتیں ہیں جو جگر جگر دگر دگر کی خوش آیند جھلک دکھ دیتی ہیں۔ بشرطیکہ آدمی خود اختلاف کے مزے نہ لینا شروع کر دے۔ مغرب کی نماز اور افطار میں جو فرق یار لوگوں نے کر رکھا ہے ہر شخص کو معلوم ہے۔ شیعہ دیر ہی کرتا چلا جاتا ہے۔ سنی جلدی ہی مچائے ہے۔ حالانکہ دونوں "ثم اتموا الصیام الی اللیل" پر مضبوط ہیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو شاید صدوق علیہ الرحمہ کا جن سے بڑا آدمی معصومین کو چھوڑ کر شیعوں کے یہاں نہیں گذرا ہے۔ حکم ہے کہ قرص آفتاب غایب ہونیکے بعد مغرب کی نماز میں انتظار کی ضرورت نہیں۔ غروب آفتاب بدیہیات میں سے ہے جسمیں مجتہد یا مولوی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ سنی حضرات بھی افطار اور مغرب میں وہ عجلت کرتے ہیں کہ دیکھ کر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ فرق کرنا اصل مقصد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیر نہ ہونے پائے ورنہ روزہ مکروہ ہو جائیگا

لیکن اگر روزہ جلدی کھل گیا تو کیا ہوگا۔ ان کانوں نے اذان سُنی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان آنکھوں نے دھنک دیکھا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں پر دھوپ کی زردی بھی دیکھی ہے۔ یہ اسی جلد بازی کا نتیجہ ہے جو حضرات علماء نے اپنے مریدین اور معتقدین پر قبضہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی مسجد کے زیر سایہ خرابات یعنی غریب خانہ ہے خدا کا ایک بندہ اس میں اذان دیتا ہے اور چاہے کوئی آئے نہ آئے وہ مسجد میں وقت سے حاضر ہو جاتا ہے۔ ان مولوی صاحب کے پیچھے میں نے اکثر نماز پڑھی ہے۔ رمضان شریف گذر چکے تھے شوال کا مہینہ تھا۔ مولوی صاحب نے اذان دی اس کے بعد آسمان پہ دھنک دکھائی دیا۔ میں نے بعد کو مولوی صاحب سے ازراہ بے تکلفی کہا مولوی صاحب میں تو آپ کو مسلمان سمجھتا تھا۔ مگر آپ تو بڑے سُنی ہی نکلے۔

اس دن سے مولوی صاحب کی اذان سب اذانوں کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اور کسی پڑھے لکھے سُنی نے اعتراض بھی نہیں کیا کہ تم نے اذان دیر کو دی۔ اکثر حضرات فرنگی محل نے بھی مغرب کی نماز ان کے پیچھے پڑھی ہے مگر کسی نے اشارتاً کنایتہً بھی ان پر دیر کو اذان دینے کا الزام نہیں لگایا۔

نکاح ایک دوسرا مسئلہ اسی طرح کا ہے۔ حضرات علمائے فریقین نے اپنے معتقدین اور مریدین کے جہل پر بھروسا فرما کر ایک صاحب نے اس کا نام "نکاح" رکھا ہے اور دوسرے نے صیغہ لغت میں نکاح کے معنے شاید صیغے سے وسیع تر ہیں۔ لیکن معاہدۂ نکاح دونوں میں عام ہے۔ شرائط میں اہل سنت کے یہاں ایجاب و قبول مہر و اعلان ضروری ہے۔ شیعوں کے یہاں بھی یہی سب کچھ ہے صرف اعلان کی شرط نہیں ہے۔ میں عرض کرتا ہوں جن معاہدوں میں اعلان ہو جاتا ہے ہزار میں نو سو ننانوے ہوتے ہیں۔ کبھی

www.taemeernews.com

ان میں تو فرق نہ کریں۔ عموماً دو حضرات صیغہ جاری کرتے ہیں اور ایک صاحب نکاح پڑھتے ہیں۔ حالانکہ ایک آدمی بھی صیغہ جاری کر سکتا ہے اور دو آدمی بھی نکاح پڑھ سکتے ہیں۔

مجھ کو صرف یہ عرض کرنا ہے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کو لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ جس کے اوپر گذر چکی ہو وہی جانے۔ میری پہلی شادی کے وقت نکاح کا تجربہ مجھ کو کم تھا جو جو آفتیں سُنّی شیعہ اعزا کے ہاتھوں میری مرحومہ بی بی اور مجھ کو جھیلنی پڑی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں یا ہمارے اعزا بروز قیامت انشاء اللہ جانیں گے۔

میری پہلی بی بی مرحومہ پر زور ڈالا جاتا تھا کہ وہ شیعہ ہو جائے مگر میں نے اس مرحومہ کو صلاح دی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ہرگز اپنا مذہب نہ بدلے چنانچہ مرحومہ کا اپنے قدیم طریقے پر انتقال ہوا اور اسی طریقہ پر سپرد خاک ہوئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

میں خود وصیت کر چکا ہوں اور کہتا ہوں کہ خدا ایسا کرے کہ ہر ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ“ کہنے والا مجھ کو سپرد خاک کرے اور میرے لیے نماز جنازہ پڑھے۔ نہ یہ کہ میرے جنازے پر لاٹھیاں اُٹھ جائیں اور میرا مردہ اُس آخری حق سے محروم رہے جو کلمات شہادتین پر یقین رکھنے والے کا حق ہے۔

سُنّی شیعہ کی شادی آپس میں نہ ہونا عجیب تازہ مصیبت ہے اس خیال سے ضرور رکاوٹ ہوتی ہے کہ ممکن ہے شوہر بی بی پر ظلم کرے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ رشتہ محبت تازہ ہو جانے سے دونوں کی تلخیاں کم ہو جائیں چنانچہ جب ایک شیعہ لڑکی کا عقد ایک سُنّی لڑکے کے ساتھ طے پایا

تھا۔ فریقین کے اکثر اعزا مخالفت پر تل گئے۔ عین وقت پر ایک شیعہ مولوی صاحب نے صیغہ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ ناچار دوسرے مولوی صاحب جو میرے بھتیجے ہیں اور جن کی شاگردی اور استادی پر مجھ کو فخر ہے یعنی مجتہد سلطان حسن نے دونوں طرف سے عقد پڑھا۔ یہ مجتہد صاحب علی گڑھ کالج میں ابھی تک شیعہ ڈین تھے۔ ان کے پیچھے اکثر سنی لڑکے نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر شیعہ لڑکے سُنیوں کی جماعت میں نماز پڑھ کر شیعہ رجسٹر میں آ کر حاضری لکھا دیتے تھے۔ موصوف نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ شیعہ سنی طلبہ کو تاریخ اسلام ساتھ پڑھائی جائے مگر مولویت نے درمیان میں پھر تلوار رکھ دی۔ عمرانیات کی رو سے بھی شیعہ سُنی میں قرابت بند ہو جانا بڑی نکبت ہے۔ نوجوان حضرات اس پر غور فرمائیں میرے پڑھنے والے! اختلاف پیدا کرنے والوں کی حد اس درجہ تک پہونچ چکی ہے کہ ایک صاحب السلام علیکم فرماتے ہیں اور دوسرے صاحب سلامٌ علیکم کہتے ہیں۔ حالانکہ زیارات میں شیعہ ہر جگہ السلام علیک یا ابا عبد اللہ وغیرہ پڑھتے ہیں اور سُنی قرآن میں سلامٌ علیٰ آل یٰسین وغیرہ پڑھتے ہیں۔ میں نے ہنس کر الف لام اور تنوین دونوں چھوڑ دی ہیں اور صرف جولاہوں کے سَلامالیکم پر اکتفا کی ہے۔ مسلمان یہ نہ خیال فرمائیں کہ سُنی شیعہ میں ہر جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔ میں نے ایک بات میں پوری طرح اتفاق بھی دیکھا ہے ہر مسلمان اس پر فخر کرتا ہے۔ اور بجا فخر کرتا ہے کہ اسلام نے صفائی کے اصول سکھائے اور ہر جگہ اس کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ مسواک کے لیے بھی سنت ہے کہ نماز کے پہلے کی جائے۔ میں نے حرم مدینہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جیسے ہی اذان شروع ہوئی اکثر شرع کے پابند حضرات نے جیب سے یا عمامے کے پیچ سے چھوٹی چھوٹی مسواکیں نکالیں اور سنت کی پیروی شروع کی۔ چونکہ حرم

www.taemeernews.com

میں قالین کا فرش ہے اس لیے تھوک تو سکتے نہیں لہذا غوبہ کیا ہوا؟ میں نے اپنی آنکھوں سے سنی اور شیعہ علماء کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ یہ ہے صفائی اور یہ ہے سنت رسولؐ کی پیروی۔

آخر میں ان حضرات سے معافی کا بجز خود خواستگار ہوں جن کو یہ کتاب پڑھ کر تکلیف پہونچے۔ طنزیہ عبارت لکھتے لکھتے عادت خراب ہوگئی ہے جیسے کوئی شریر لڑکا ہوتا ہے کہ راستہ چلتے شرارت کیا کرتا ہے۔ (ورنہ غالبؔ مرحوم تصرف معاف فرمائیں)

طنز و مذاق ہو یہ طبیعت بُری نہیں
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں عزیزی غلام اصغر صاحب کا شکریہ ہے جن کی امداد کے بغیر یہ کتاب تیار ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسناد ڈھونڈھنا۔ مسودہ صاف کرنا۔ مسکرا مسکرا کر میرا دل بڑھانا۔ ان تمام باتوں کا بہت بہت ممنون ہوں۔

برخوردار محمد رضا شبر سلمہ کو خدا علم و عمر و دولت دے جنھوں نے آخری نقل اتاری اور جہاں میں اُول جلول آدمی املاء وغیرہ میں غلطی کر گیا تھا یا زود روی میں کچھ کا کچھ لکھ گیا تھا اس کو ٹھیک کیا۔

"مصنف"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم النبیین وآلہ الاطہار المجتبین واصحابہ الاخیار اجمعین ۰

امابعد!

راقم الحروف محمد علی ردولوی عفی عنہ انانیت کا شکار باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔ "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر "میں" پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ناچار آپ بھی درگزر سے کام لیجیے۔ اور اگر کوئی اچھی بات نکل آئے تو اس کو قبول کیجیے۔ نہیں تو بہ نظر عبرت میرے لیے دعائے خیر کیجیے اور اس تحریر اور تحریر کرنے والے کو بھول جائیے۔

لارڈ مارلے کو جب وائیکاؤنٹ کا خطاب بادشاہ انگلستان نے دیا تو انھوں نے لارڈ منٹو کو لکھا: "ملک اور قوم کی خدمت میں عمر کاٹ دی۔ اس بڑھاپے میں وہ چیز گلے پڑی جس سے عمر بھر بھاگتا رہا۔ اب آخر عمر میں خطاب کلنگ کا ٹیکہ ہو کے ماتھے پر لگا۔ محبتِ وطن کے لئے یہ بھی قبول ہے۔ اس بڑھاپے میں دربار عوام کی محنت نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس ذریعہ سے دربار امرا ہی میں کچھ تھوڑا بہت مشغلہ خدمت جاری رہے گا۔" نہ معلوم سچ یا جھوٹ اسی طرح میں بھی

www.taemeernews.com

اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ یہ "حقیر میں" کی بھرمار اسی وجہ سے کر رہا ہے۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔

میں شیعہ گھر میں پیدا ہوا اور شیعہ تربیت پائی۔ لیکن تبرا سے ہمیشہ نفرت رہی۔ یہ پہلی بنا مذہب سے بغاوت کی تھی جو مجھ کو یاد ہے۔ میری بڑی بہن مرحومہ کے لیے ایک مولوی نوکر تھے۔ جب میری بسم اللہ ہوئی تو میں بھی ان کے پاس بٹھا دیا گیا۔ ان مولوی صاحب کا تھوڑا سا حال بیان کر دوں تو شاید میری تربیت کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام مولوی واجد علی تھا۔ سن تقریباً چالیس اور پچاس کے درمیان میں رہا ہوگا۔ چھوٹا سا قد۔ منہ پر کھچڑی داڑھی۔ تلاوت بڑی روانی سے کرتے تھے۔ دو روپیہ مہینہ اور کھانا پاتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا علاقہ کورٹ میں تھا۔ اس لیے عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ مگر غرور اور بڑائی کا سامان پھر بھی مہیا تھا۔ جو لڑکے میرے ساتھ کھیلتے تھے وہ اپنے انداز سے مجھ پر ظاہر کرتے تھے کہ تم امیر آدمی کے بچے ہو۔ ہمارے یہاں سے مولوی صاحب کو تین جوڑے روٹی اور دال دونوں وقت ملتی تھی۔ یہ روٹیاں بہت پتلی اور چھوٹی ہوتی تھیں دو روٹیاں ان میں سے مولوی صاحب کبوتروں کے لیے توڑتے تھے۔ باقی دس روٹیوں میں جو بچا ہوا اس کو بہ اصرار شریک کر لیتے تھے۔ پیٹ نہ بھرنے کی شکایت جہاں تک یاد ہے کبھی نہ کی۔ نہ کوئی انداز ایسا یاد ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو۔ تین مہینے کے روزے رکھتے تھے اور ہر وقت خوش رہتے تھے۔ اس سن میں ہم پڑھتے کیا رہے ہوں گے مگر یہ مجھ کو یاد ہے کہ اکثر کاندھے لگا کر مجھ کو سلا دیتے تھے۔ اور آب دست بھی دیدیتے تھے۔

میری عمر کے ساتویں سال دوسرے مولوی مقرر ہوگئے۔ اس لیے یہ واقعات میری عمر کے چھٹے سال تک کے ہیں۔ ہمارے دادا سنی تھے مگر دادی شیعہ تھیں۔

میرے والد بذات خود شیعہ ہو گئے تھے اس لیے میرے گھر میں (کم سے کم ددھیال میں) تشیع کا رواج کم تھا۔ کیونکہ نوکر چاکر سب سُنی ہی تھے۔ البتہ امور مخصوصہ طہارت غیر مسلم کے یہاں کی چیز سے احتیاط پورے طور سے تھی۔ مجالس تعزیہ داری اور دوسرے تمام مناسک جو شیعہ گھروں میں ہوتے ہیں برابر ہوتے تھے۔ کیونکہ میری والدہ مرحومہ بڑے کٹر شیعہ گھر کی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سُنی مولوی کا ہے۔ وہ نکال دیئے جائیں جہاں تک یاد پڑتا ہے اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی۔ کیونکہ میں مولوی صاحب سے زیادہ مانوس تھا۔ اور لوگ جانتے تھے کہ اس طرح لڑکا دب جائے گا۔ میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہونچی تھی۔ مولوی صاحب کا رویہ میرے دل پر نقش کا الحجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لے لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا۔ جو کچھ تمھاری ماں کہتی ہیں کہہ دو۔ پیار کرنے میں اُنکی بیچ سے مُنڈی ہوئی مونچھیں میرے گال پر گڑ جاتی تھیں۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے۔ اور جو کچھ سمجھاتے رہے ہوں مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس امر کا پورا یقین ہے کہ اُنھوں نے تشیع کے خلاف کسی موقع پر کچھ نہیں کہا۔ گو اور لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے باپ بے تعصب تھے۔ گویا اسی طرح سے شیعیت کے خلاف رجحان ڈالا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے بعد جہاں تک خیال جاتا ہے میں پوری طرح سے شیعہ رہا۔ اور مجلسوں میں کمسنی ہی میں تبرائی مشہور تھا۔ یہ حالت اس وقت تک ہے۔ خیر اب تو بڑھاپے کی وجہ سے رقت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر باتیں کرنے میں رسول اللہ اور حسینؑ کا نام بغیر بیتاب ہوئے نہیں لے سکتا۔ مگر اس میں بڑا حصہ اعصاب کی کمزوری

کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال میرے دل میں اہلبیت کی محبت ہمیشہ جاگزیں رہی اور آج بھی عقل کی بنا پر بہت ہے۔ گو عقیدت کی بنا پر اس درجہ کی نہ ہو تب بھی میں ان حضرات کی دماغی۔ دلی۔ وجدانی۔ نسلی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کرکے خوش ہوتا ہوں۔ اور دل کے اندر بحمد اللہ ایک کشادگی پاتا ہوں۔

میرے یہاں علاوہ اور مناسک عزا کے مہندی بھی اٹھتی تھی۔ جوانی پر پہونچ کر سب سے پہلے اس معاملہ میں دلی پریشانی شروع ہوئی۔ مجالس میں اکثر بھی شیعہ علماء اور پڑھے لکھے حضرات سے سنتا آتا تھا۔ کہ حضرت قاسم کی شادی کی روایت کربلا میں ضعیف ہے۔ ضعیف کے لفظ کے معنی تو جانتا تھا۔ مگر علم حدیث میں اس کے اصطلاحی معنوں سے ناواقف تھا جب معلوم ہوا کہ یہ وہ روایتیں ہیں جن میں اُس وقت سے لے کر اس وقت تک تمام راویوں کا سلسلہ ایک طرح کا نہیں تو سمجھ میں آیا کہ یہ اُن الفاظ میں سے ہے جن کے لیے بجائے ایک بدنما لفظ کے ایک خوبصورت لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے آٹھ برس کے گھوڑے کو ٹوٹے پنچ کہتے ہیں۔ کسی بحث میں ضعیف روایت قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔ مگر ہم معتقدین کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس آفت میں جو کربلا میں تھی شادی کیا ہوئی ہوگی۔ مگر اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ساتویں محرم کو ہمارے یہاں دس بجے رات کو مہندی اٹھتی تھی اور تقریباً دو بجے حضرت عباس کی درگاہ پہونچ جاتی تھی۔ پھر روز روز کے ہجوم میں ترقی ہو جانے کی وجہ سے ہماری مہندی اکثر صبح ہوتے ہوتے درگاہ پہنچنے لگی۔ لوگوں کی تکلیف۔ قوم کی محنت اور اس کے ساتھ یہ بھی ڈر کہ کہیں روشنی کا سامان نہ کم پڑ جائے۔ میں حقیقت چاہتا تھا کہ لوگ جلدی کریں

مگر جوشِ عقیدت میں یہ بری بات کم مانی جاتی تھی۔ ایک بار ہم گھر اس وقت پہونچے جب صبح کی نماز کا وقت قریب تھا۔ لوگوں نے ہاتھ پاؤں دھوئے چائے پی۔ اتنے میں صبح کی اذان ہوئی۔ گو اس وقت میں نماز کا پابند نہ تھا مگر اہلبیت کے کارنامے دل میں حاضر تھے۔ میں نے لوٹے اور تسلے رکھوا دیئے کہ مومنین نماز بھی ادا کر لیں۔ مگر ایک صاحب نے بھی یہ نہ کیا۔ ممکن ہے کہ بعض نے گھر پر جا کر پڑھی ہو لیکن میرے یہاں سے مسکرا مسکرا کر سب چلے گئے۔ میری آنکھیں کھل گئیں کہ نماز قائم کرنے کی بہترین مثال کربلا میں ہوئی اور ہم نے گریہ و بکا و ماتم اور عقیدت کے باوجود نماز نہیں پڑھی۔

اب ہمارے وطن کا محرم اور ترقی پکڑ گیا۔ بڑی لمبی مجلسیں۔ بڑے علمی ذاکرے۔ منطق کی الٹ پھیر بڑھ گئی۔ مومنین مختلف وجوہ سے مجلسوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مگر رقت کم ہو گئی۔ لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ جب تک گریۂ وزاری کا خوب شور نہ ہو عموماً ذاکرین بند نہیں چھوڑتے۔ اگر ایک بینیہ ٹکڑے پر رقت خوب نہ ہوئی تو ذاکر صاحب نے پھر سے تمہید شروع کی اور پھر کوئی بینیہ گوشہ نکالا۔ اس ڈر سے کہ کہیں صاحب پھر سے تمہید نہ شروع کریں۔ لوگ ہو ہو کر کے رو پڑتے ہیں۔ بڑی مجلسوں میں کچھ رونیوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی ذاکر کی پُرجوش تقریر اور واقعی دل سے پڑھنے پر بے اختیار گریہ ہوتا بھی ہے۔ چاہے مجلس تھک گئی ہو اور پریشان ہو کر رو دے یا واقعی دل سے رونا آئے۔ ہر شخص ختم مجلس پر خوشنودی بھی ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے "آل مجلس" خوب ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال گذرنے لگا کہ آل مجلس رونا کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے من بکی علی الحسین او ابکی او

متباکی اوجبت لہ الجنۃ ۔ اول تو اس کے ترجمہ میں منطق کا کمال دکھایا جاتا ہے۔ یعنی "متباکی" کے معنی بجائے "بہ تکلف رونے کے" "رونے والوں کا سا منہ بنانا" بیان کیے جاتے ہیں۔ گو دونوں معنوں میں فرق ظاہر ہے۔ لیکن اگر کوئی جرأ کرکے اعتراض کرے تو جواب موجود ہے کہ "منہ بنانے میں بہ تکلف رونا تو ہوتا ہی ہے"! (قربان جائیے اس منطق کے) علاوہ اس کے پڑھے لکھے لوگوں نے مجھکو بصیغۂ راز بتایا بھی ہے کہ یہ حدیث کسی معصوم تک پہنچتی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب اس معاملہ میں میری تسکین کر دیں تو انشاء اللہ عنداللہ ماجور ہونگے اور یہ ناچیز بھی ہدیۂ تشکر پیش کرے گا۔

ماتم مجلس اہلبیت کی پیروی اگر کہی جائے تو ایک بات بھی ہے۔ خود رونا ماتم مجلس کیسے ہوا؟

جس وقت مصائب اہلبیت سن کر گریہ گلوگیر ہوتا ہے تو بڑے بڑے لوگ پکار اٹھتے ہیں "یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا"۔ چنانچہ میں بھی یہی کرتا اور اپنے زعم ناقص میں دل سے کرتا تھا۔ حقائق کی ستم ظریفی: دیکھیے یہ آیۃ قرآن پاک میں کسی موقع پر آئی ہے۔*

جب پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی اور عراق بھی انگریزوں کے قبضہ میں

---

* یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا [illegible] ۵ پارہ دیکھیے)
[illegible] اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْکُمْ

مُّصِیْبَۃٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَکُنْ مَّعَھُمْ شَھِیْدًا وَلَئِنْ اَصَابَکُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوْلَنَّ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا ۔ ترجمہ: اے ایمان والو خوب ہی خبرداری کرو۔ پھر جدا جدا فوج کی صورت میں کوچ کرو یا ایک ساتھ جمع ہو کر۔ اور تم میں [illegible] جو جہاد میں جانے سے [illegible]

آگیا تو میں نے محسوس کیا کہ بھئی "یالیتنی" ہم کہتے تو ہیں مگر جی میں دوسری ہی بات ہے۔

کربلا۔ نجف۔ کاظمین۔ سامرہ۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور ہم چپ رہے۔ ہم سے جب چھوٹی چھوٹی قربانیاں نہیں ہو سکتیں تو کربلا کی قربانیاں کیسے ہوتیں۔ دل نے کہا "محمد علی ہیز ہو۔ نامرد ہو۔ جب تم جانتے ہو کہ یہ قربانیاں تم سے نہیں ہو سکتیں تو فضول اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لیے "یالیتنی" کیوں کہتے ہو۔ اگر تم امام حسینؑ کی تاسی کرو تو مواقع آج بھی موجود ہیں مگر تم سے نہیں ہوتا۔ پھر یہ جھوٹ موٹ کیا ہوا باندھتے ہو۔ بجائے "یالیتنی" کہنے کے حاضر و ناظر۔ سمیع و بصیر خدا کے آگے شرمندہ ہو۔ اتنا بڑا جھوٹ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا رہے ہو خیر تم سے قربانی کہاں ہوگی۔ اور تاسی کیا ہوگی۔ یہی بے ایمانی چھوڑ دو کہ "یالیتنی" کہتے ہی شرمایا کرو۔" چنانچہ برہا برس ہو گئے یہ بڑی بات اس چھوٹے سے منہ سے نہیں نکلی

گو میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے دل کی صحیح کیفیات نکال کر آپ کے آگے رکھ دوں۔ مگر یہ سہل کام نہیں ہے۔ آدمی اپنے زعم ناقص میں واقعہ بیان کرتا ہے۔ مگر نفس نقاب کے اندر نقاب اور اس کے اندر نقاب ڈالے بہروپیا بنا بیٹھا رہتا ہے اور لکھنے والا خود دھوکا کھا جاتا ہے ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴)

کرتے ہیں۔ اور کوئی مصیبت تم پر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں اللہ نے ہم پر فضل کیا ہم مجاہدین کے ساتھ موجود نہ تھے۔ اور اگر ہم پر اللہ کا فضل ہوا تو اس طرح کہتے ہیں گویا تم میں اور ان میں کچھ دوستی ہی نہ تھی۔ کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی بڑی کامیابی حاصل ہوتی (سورۃ نساء، آیت ۷۱ ۔ ۷۲ ۔ ۷۳)

ہیں خواب ہی میں جو ابھی جاگے ہیں خواب سے

اس لیے پڑھنے والوں سے گذارش ہے کہ میرے اعتراف کو ایک پلہ میں رکھیں اور اپنے نفس اور خیالات کو دوسرے پلہ میں اور پھر اندازہ کریں۔ اگر میرا والا پلہ ہلکا ٹھہرے تو بجائے مجھ سے نفرت کرنے کے ازراہ ترحم میرے لیے ہدایت اور مغفرت کی دعا مانگیں۔

بہرحال سنیئے۔ میرے ایک ہم وطن کے یہاں مجلس تھی۔ میں بھی شریک مجلس تھا۔ ذاکر صاحب نے منبر پر پہونچ کر مجھے قریب منبر بیٹھنے کی دعوت دی اس کے بعد لڑکیوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھانے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے پر اعتراضات جڑے۔ جہاں تک خیال پڑتا ہے اس وقت میری ہی لڑکیاں الٰہ آباد یا لکھنؤ کے اسکولوں میں پڑھنے گئی تھیں۔ اس بات کو حاضرین میں سے سب نے محسوس کیا کہ ذاکر کا روئے سخن میری ہی طرف تھا۔ اور اسی دن سے ان کی مجلس اور تقریروں کے سننے کے وقت میرا نفس ہمیشہ شریک رہا۔ میرے دل نے کہا۔ ذاکر صاحب کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر اس نے (یعنی میں نے) بانی مجلس سے لڑائی کر لی تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر یہ کہا بدا تو بھی ایک ملحد کو خوب ذلیل کیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ اگر بانی مجلس سے لڑ گیا تو جو شخص مجھ سے خار کھاتا ہے اس کو خوشی ہوگی۔ میرے وطن کے حضرات اہلسنت الگ خوش ہوں گے کہ شیعوں میں خوب تفرقہ پڑا۔ اس لیے میں پی گیا۔

ان ذاکر صاحب سے مجھ سے چشمک کیوں تھی؟ شروع جوانی سے میرے خیالات صرف ملحدانہ نہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ بالکل دہریت کے تھے، در مُنہ بحث بھی ہمیشہ کا تھا۔ آدمی کی طبیعت عجیب گورکھ دھندا ہے۔ خیالات "مل"، "ہربرٹ اسپنسر" اور اسی طرح کے دوسرے مصنفین کی کتابیں پڑھ کر

دہریت کے ہو گئے تھے۔ مگر بچپن کی تربیت کی وجہ سے باوجود بہت سے شکوک کے پھر بھی شیعوں کا صرف ہمدرد ہی نہیں تھا بلکہ شیعوں کو جادۂ مذہب سے ہٹا ہوا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ تبرا ہمیشہ خلاف طبیعت رہا اور شروع شروع اگر کہا بھی تو جی کے اندر شرمندہ سا ہوا۔

اس کے سمجھانے کے لیے ایک دوسرا قصہ بیان کرنا پڑے گا۔ مولانا کرامت حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ بیرسٹر اور سابق جج الٰہ آباد ہائی کورٹ جنھوں نے اپنی عمر کی پوری کمائی لگا کر کرامت حسین مسلم گرلز کالج قائم کیا تھا جو آج تک لکھنؤ میں ہے بڑے ذی علم تھے۔ ان کی تصانیف قانون و اخلاقیات کے اوپر ایسی تھیں کہ امریکن اخباروں نے جہاں نہ مروت کا سوال تھا نہ سفارش کا ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ "ان کو پڑھ کر "جرمی بنتھم اور "آسٹن" یاد آجاتے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگ ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے رُکتے تھے۔ اُن کے چچازاد بھائی مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے پڑھائی۔ یہ بزرگ بڑے فلسفی بھی تھے اور ہربرٹ اسپنسر کے ماہر تھے۔ میں بھی ان کے قدموں سے لگا رہا اور یہ زمانہ میری عقل و دماغ کی صیقل کا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد میں نے ایک مختصر رسالہ "یادگار کرامت حسین مرحوم" کے نام سے لکھا جس میں بعض باتیں سخت لکھ دیں اور میں بھی "لا ادریت" کا خطاب پا گیا۔ اور شرمندہ نہ ہوا۔ شیعہ عموماً مجھ سے خفا ہو گئے مگر میں آزاد خیالی پر فخر و مباہات ہی کیا کیا۔ اگر کھاتے پیتے گھر کا آدمی نہ ہوتا تو شاید دوسروں کے ڈر سے اپنے خیالات کا اشتہار نہ دیتا۔

میرے ایک دوست یکرنگ اور بڑے قابل آدمی شیخ ولایت علی قدوائی مرحوم تھے۔ ان کی صحبت میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں۔ اور دوسرے پہلو سے بھی میرے اوپر ان مرحوم کا بہت اثر ہوا۔

شیعہ لوگوں کا رجحان یوں ہی ارسٹاکریسی کی طرف مائل ہے اور پھر میری تربیت بھی کالون تعلقدار اسکول (جو اب کالج ہے) میں ہوئی تھی جس سے اس قسم کے خیالات اور مضبوط ہو گئے تھے۔ ولایت علی مرحوم کی صحبت میں مجھکو ڈیماکریسی کی خوبیاں معلوم ہونے لگیں۔ خیالات جو بچپن سے انگریز پرستی کی طرف راغب تھے اس میں فرق آنے لگا۔ لیکن جائداد سے محروم ہونے کا دھڑکا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے بعد تکلیف کا خوف۔ یہ چیزیں پالیٹکس کے میدان میں انگریزوں کے خلاف آنے سے روکتی رہیں۔ پھر بھی گورنمنٹ کے خوشامدیوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا۔ گو میرا مدعا صرف اپنی مذہبی ارتقا کا بیان کرنا ہے مگر ایک واقعہ عرض کرتا چلوں جس سے شاید میری افتاد طبیعت کا پتہ چل سکے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میرے بڑے دوست تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا "میں تمھارا بہی خواہ ہوں۔ اور تمھارے لیئے میں نے ایک کام تجویز کیا ہے۔ جس میں تم کو بڑے بڑے فائدے ہوں گے اور وہ یہ ہے کہ جو باتیں تم دوسروں کو کرتے سنو اس کی رپورٹ ہم کو دیا کرو۔" میں نے کہا "دوستی کی آڑ لیکر اور باتوں باتوں میں آپ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتے ہیں کیونکہ مجھ کو راز رکھنے کی حکمت ہی نہیں معلوم۔ لیکن اگر ارادتاً آپ کو اس قسم کی رپورٹیں دونگا تو پھر میرا دل مجھ کو اس قدر برا کہے گا کہ میں شاید سو نہ سکوں۔" وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔ اور دوسرے ہی دن ایک صاحب کو اسی خدمت کے لیے مامور کر دیا۔ ان کو ہزار روپیے کی معافی ملی۔ خان بہادر ہوئے اور دوسرے اعزاز بھی ہاتھ آئے۔ اس قصہ سے شاید میرے پڑھنے والوں کو کچھ پتہ چل گیا ہوگا کہ مذہب کے مقابلہ میں کبھی دل میں کچھ اور منہ میں کچھ اور مجھ سے کبھی بن نہ پڑا تھا۔

دوسرے ذاکرین جو میرے قصبہ میں مجلس پڑھنے کے لیے آیا کیے وہ بھی مجھ کو اسی حقارت کی نظر سے دیکھا کیے۔ میرے قصبہ کے ایک صاحب جنھیں مجھ سے کافی یگانگی اور خلوص تھا اور جو باوجود مراسم کے میرے مذہبی خیالات کو بُرا سمجھتے تھے ہنسی کے پیرایہ میں ایک دن میرے عقائد پر اعتراض کرنے لگے کچھ تعزیہ داری کا ذکر تھا مجھ کو تاؤ آگیا اور میں نے بھی سختی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اس وجہ سے اُن سے تو ملال ہو ہی گیا مگر اسی دن سے کم و بیش میرے عقائد دوسروں پر بھی کھل گئے۔

دوسرا باب

اسی زمانہ میں میری بی بی مرحومہ حج کو گئیں۔ دوسرے یا تیسرے دن میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کسی کو بتائے چلا گیا۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے میرے دل کو ہمیشہ لگاؤ رہا۔ چنانچہ ایک قصہ عرض کرتا ہوں۔

میں اپنے تشیع کے زمانہ میں ایک مرتبہ محفل حال وقال میں قوالی سن رہا تھا۔ قوالوں نے رباعی شروع کی ؎

صبا تحیت شوقم بہ آں جناب رساں　　حدیث ذرۂ بیدل بہ آفتاب رساں
دراں مقام کہ آرامگاہ حضرت اوست　　زمیں بوس و سلام من خراب رساں

میرے اوپر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ سر سے پاؤں تک ایک رو دوڑ گئی۔ اسکو روکنے کی کوشش میں میرے جسم میں کپکپی پڑ گئی۔ دل کے اندر یہ خیال آیا کہ اب گھر نہ جاؤ۔ اسی طرف سے سیدھے اٹھو اور مدینہ نکل چلو۔ طرفۃ العین میں جانیکا پروگرام تو بن نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس خیال نے پوری طرح سے مجھ پر ایک لحظہ کے لئے قبضہ کر لیا تھا۔ کون جانے کہ میرا نام اسی وقت درباریوں میں نہ لکھ لیا گیا ہو۔ رع رحمت حق بہانہ می جوید۔ زمانہ گذرتا گیا اور میری کفر و الحاد و عقیدت کی دیوانی ہانڈی دم پہ چڑھی رہی۔

کچھ باتیں آگے پیچھے ہوتی جاتی ہیں مگر یہ ناگزیر ہے۔ میرے خیال میں

باوجود اس خامی کے اگر میں اپنی برائیوں یا خیالی اچھائیوں میں کوئی کمی بیشی نہ کر گیا تو میرا مطلب حاصل ہے۔ اور شاید ایک آدمی کی صحیح یا قریب بہ صحت تصویر کھنچ جانے سے دوسرے کا بھی فائدہ ہو جائے۔ میرے ایک دلی دوست تھے جو بہت صفات رکھتے تھے وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ دل میں کوئی بات اچھی یا بُری رکھتے نہیں۔ اس خیال سے ایک امید لگی ہے کہ شاید کچھ باتیں دیانت کے ساتھ بیان کر جاؤں

اب اپنے حج کے سفر کی طرف عود کرتا ہوں۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اُس زمانہ میں میرا الحاد اگر عزت الکمال کے درجہ سے بھی اتر آیا تھا تب بھی باقی ماندہ زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا "تم بھی حج کو جاتے ہو؟" میں نے کہا "میں کہاں جاؤں گا" مرحومہ کے جانے کے بعد رات کو یہ خیال ہوا "محلی اچھا موقع ہے" دل میں بی بی کے دیکھنے کا بھی خیال تھا مگر اس کے ساتھ یہ خیال کہ ایسا مبارک موقع ہاتھ سے نکل جائے گا، دل میں اچھا خاصہ درجہ رکھتا تھا۔ دل نے کہا اگر آج نکل چلو تو خوب ہو۔ نہیں تو پھر مدینہ کی زیارت نصیب نہ ہو گی۔

میرے پڑھنے والو! جب میں مدینہ منورہ کی حاضری یا اپنی بی بی مرحومہ کا ذکر کرتا ہوں تو "بور[1]" ہو جاتا ہوں، لوگ زبان حال سے کہتے ہیں "لو غضب ہوا"

"مدینہ طیبہ کا کیا کہنا۔ مگر بیان کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ بار بار وہی قصہ کہاں تک مزہ دے۔ بی بی کے ذکر پر کہتے ہیں "لے لو بڑھیا نہ معلوم کب مر چکی۔ مجور صاحب نے دوسری شادی بھی کر لی۔ مگر ہماری جان کا عذاب

---

[1] لفظ انگریزی ہے۔ جس کے معنے سرد طبیعت کم عقل کے ہیں یا وہ مکلف باشعور (ترجمہ از راقم)

چلا جاتا ہے۔" ہمدردوں کو کون سمجھائے کہ جوانی کا ساتھی بڑھاپے میں بھی دُکھ دے جاتا ہے۔ میرے ناظرین اگر اس جگہ پر تھوڑا سا چھوڑ جائیں گے تو مجھے شکایت نہ ہوگی۔ بہرحال کچھ غیر مکمل کپڑے اور کچھ غیر مکمل زادِ سفر لیکر نکل تو کھڑا ہوا مگر دل میں کہتا تھا کہ محمد علی تم ملحد، بے ایمان۔ تم کو اس دربار میں باریابی کیسے مل سکتی ہے۔ پہلی ٹھوکر تو یہ لگی کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ پتہ چلا کہ بجائے نئے کپڑوں کے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا لایا ہوں۔ اور بجائے نئے پائجاموں کے بیاہ شادی کے دسترخوان کی پوٹ باندھ لایا ہوں۔ مگر میں ریل پر سوار ہو ہی گیا۔ جھانسی میں ریل چھوٹ گئی۔ میرے ہم وطن اور بچپن کے یار مولوی بدرالحسن صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے ہاں اٹک گیا۔ دل نے کہا اس روک ٹوک کا مقابلہ تم کب تک کر سکتے ہو۔ مگر میں دوسرے دن بمبئی چل ہی دیا۔ وہاں بی بی سے ملاقات ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگیں "ہم کو رخصت کرنے چلے آئے۔" میں نے کہا "ہم بھی چلیں گے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "تم اور حج" میری ایک عزیزہ بھی جا رہی تھیں۔ وہ مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ کہنے لگیں "مجھے یقین نہیں۔ جب تک جہاز چل نہ نکلے گا میں تمہارے سامنے نہ آؤں گی۔"

سب لوگ ٹکٹ خرید چکے تھے۔ اب ہم ٹکٹ لینے چلے۔ دفتر میں معلوم ہوا کہ فرسٹ اور سکنڈ کسی میں بھی جگہ باقی نہیں۔ بچپن کی عادت خراب تھرڈ کلاس میں جانے پر نفسِ مردود کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ اگلے جہاز کا انتظار کرنے میں "بڑھیا کے نکاح میں توا توا دھو کے"۔ نہ معلوم کیا کیا بدگمانیاں دل میں آتی تھیں۔ جیسے کوئی کان میں کہتا تھا "اب کھل گیا نا؟" آخر تم کو کیوں بلائیں کس بنا پر تم کو روضۂ مبارک دکھائیں۔" کون ایسے گُن؟ ڈھنگ کون ایسے جو بنا کر معشوقِ حقیقی تمہارا عاشق ہو جائے۔ گھونگھٹ الٹ کر بھی اپنا منہ دکھیے۔ تم

جس قابل ہو رہی ہو سکے رہے گا۔ یہاں ایک ہفتہ میں تاج محل کی کاکٹیل اور فرنچ ٹیل کے پرانے احباب روپیہ اڑا دیں گے۔ بس حج ہو چکا۔ اتنے میں اسی جہاز کے وسیع دفتر میں ایک طرف سے آواز آئی۔ "محمد علی کے تار کا جواب آیا؟" میں نے کان کھڑے کئے۔ معلوم ہوا کہ کوئی محمد علی ہیں ردولی کے۔ انھوں نے اپنی بی بی کے لیے ایک فرسٹ کلاس رزرو کرایا تھا۔ ان کو تار دیا گیا تھا کہ "تمھارا رزرو اس وقت تک موجود ہے اطلاع دو کہ تمھاری بی بی جائیں گی کہ نہیں۔"

ہوا یہ تھا کہ میں نے رزرویشن کے لیے لکھا تھا اور جواب بھی آیا تھا کہ روپیہ بھیج دو۔ مگر جو لوگ حج کر آئے تھے انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ تاریخ روانگی بدل جائے یا اور کوئی آفت آئے۔ پہلے سے روپیہ کیوں بھیجو۔ جگہ وافر ہوتی ہے اور ہر وقت مل جاتی ہے۔ چنانچہ میری بی بی نے وہاں پہنچ کر اپنا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ اور میری تحریر پر جو جگہ مقرر کر دی گئی تھی وہ الگ باقی رہی۔ جس کیبن میں میری بی بی جا رہی تھیں وہ دو برتھ کا تھا۔ اس میں یا کوئی عورت یا میں خود جا سکتا تھا۔

کارساز ما بہ فکرِ کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

گر مجھ کو اپنے اعمال کی بنا پر اب بھی دھڑکا رہا کہ تم چلے بھی گئے تو راستہ میں مرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میری منطق یہ تھی کہ اللہ میاں کسی میرے ایسے آدمی کیلیے اگر مجھ سے مشورہ لیتے تو ایمانداری سے مجھ کو کہنا پڑتا۔ مارا ہٹا۔ اس مردود کو اس پاک سرزمین پر قدم رکھنے دے۔ اسے میں نے کوئی گلا نہیں کاٹا تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ڈرا ہوا تھا۔ مگر اللہ میاں اور بندے میں جو فرق ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم بھی پہنچ گئے ۔

بصد رعشہ ام می فشاں از کون یار   گدائے غمزہ گن کہ میر مجلس شد*

جدہ پہونچ کر میں انگریزی کانسل سے ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آیا شیعوں پر کوئی ایسی سختی تو نہیں ہے کہ ان کو تقیہ کرنا پڑے؟ اس نے جواب دیا کہ سعودی لوگ حنفیوں سے زیادہ خفا ہیں۔ شیعوں کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کو جانتے ہیں کہ گئے گزروں میں ہیں۔ میں نے کانسل سے کہا کہ اگر مجکو معلوم ہو جائے کہ بحیثیت شیعہ کے کہیں ایسی تکلیف اٹھاؤں گا جو برداشت نہ کر سکتا ہوں تو میرے خیال میں اس وقت جب آدمی اتفاقیہ آفت میں پھنس جائے تو تقیہ کر لے اور پھر اس مقام سے علیحدہ ہو جائے۔ کیونکہ روز روز تقیہ کرنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس وجہ سے دریافت کیا تھا کہ اگر ایسا ڈر ہو تو میں عمرہ کرکے واپس آجاؤں۔ یہ میں نے ضرور کہا تھا۔ لیکن اگر ایسی صورت ہوتی تو شاید میں برابر تقیہ کئے رہتا۔ گویا اُس کانسل سے میں اتنا جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ اتنی دور جاکر اور پھر فوراً واپس آنا مجھ سے نہ ہو سکتا۔ تقیہ کی نسبت تب اور آج میں میرے خیالات میں بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔ آج میری سمجھ میں آتا ہے کہ تقیہ آدمی ہمیشہ کرتا ہے یہ کم و بیش فطری سی بات ہے۔ اسی فطرت یعنی حفاظت خود اختیاری کی بنا پر حضرت عمار بن یاسر کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے تقیہ کیا۔ اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ عمار کے ایمان میں کوئی فرق

---

* آج سے کچھ برس پہلے میری مرحومہ بی بی نے مجھ سے سفر حج کے متعلق دیوان حافظ میں فال دیکھنے کو کہا تھا تو یہ امید افزا شعر نکلا تھا ؎

ساقیا چو شاہد و نوشاں کنند بادہ صبوح   گو بیام زند بہ حافظ شب زندہ دار بخش

اس وقت تو ہم دونوں نے سمجھے کہ بی بی ہی کو حج نصیب ہوگا۔ یہ تو بعد میں سمجھ میں آیا کہ حافظ نے صرف اس وقت ہم کو بھی بشارت دی تھی۔

نہیں آیا۔ قرآن شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حال ہے۔ مگر وہ قرآن کے بننے کا واقعہ ہے۔ اس لیے صرف نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ قرآن پاک میں یہ قانون موجود ہو۔ ورنہ نظیر بغیر قانون کے کیا کام آسکتی ہے۔ قرآن شریف میں تقیہ کے بارہ میں سورۂ آل عمران کے تیسرے رکوع میں ایک آیت[1] موجود ہے۔ جس سے تقیہ کا حکم صریحی نکلتا ہے۔ لیکن وہ صرف کفار کے مقابلہ میں ہے۔

آیا مسلمان کے مقابلہ تقیہ کیا جا سکتا ہے؟

یہ ذرا مشکل مسئلہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حنفی مذہب میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ حضرات شیعہ قیاس پر ہنستے ہیں۔ مگر مجبوراً موقع بے موقع خود بھی کر جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو تقیہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے احکام فطرت پر مبنی ہیں اور حفاظت خود اختیاری یا فطرت کافر اور مسلمان کا فرق نہیں کرتی۔ اس لیئے وقت ضرورت مسلمان کے مقابلہ میں بھی تقیہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو تلوار مار دینا جائز نہیں ہے لیکن حفاظت خود اختیاری میں مار دینا جائز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں سے بھی تقیہ کرنا فطرت کے موافق ہے۔ تقیہ کا مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا۔ اکثروں کا دعویٰ ہے کہ ائمہ نے بھی تقیہ کیا ہے۔ یہ بڑی ٹیڑھی بات ہے۔ غور کیجیے تو آخر وہ بھی انسان تھے۔ پھر ان کو اپنے گروہ کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ

---

[1] لا یتخذ المومنین الکفرین اولیاء من دون المومنین ۚ ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیء الا ان تتقوا منہم تقٰۃ ۚ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر ۝

ترجمہ:۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو رفیق نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس سے اور اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن کسی طرح ان سے بچنا ہو تو خیر۔ اللہ تم کو اپنے جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔

میں ایسے واقعات کی کمی نہیں رہی ہے۔ جہاں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے خون کا پیاسا نہ رہا ہو۔ ایسی حالت میں میری سمجھ میں آتا ہے کہ ائمہ بھی تقیہ کرسکتے تھے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی بات دیکھنی ہے۔ یعنی کیا مذہبی مسائل میں بھی تقیہ کرسکتے ہیں؟ میری ناچیز رائے میں مسائل میں ائمہ تقیہ نہیں کرسکتے۔ امام حسین علیہ السلام نے تو کیا نہیں، امام احمدؒ بن حنبل نے تو کیا نہیں اگر تقیہ واجب تھا تو ان حضرات نے کیوں نہیں کیا۔ یا کم از کم امام حسینؑ نے کیوں نہیں کیا۔ اس سے نتیجہ یہی نکلا کہ ہر چھوٹی بات پر اس مسئلہ سے فائدہ اُٹھانا وہی منطقی کرسکتا ہے جو دین سے محبت کم رکھتا ہو اور حریف مخالف کے ہرانے کا زیادہ خیال رکھتا ہو یا خود غرضی کی بنا پر شرعی مسئلہ کو آلۂ کار بنانا چاہتا ہو۔ اس مسئلہ کو میں خود اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے۔

بہت سے حجاج کفایت اور آسانی کے خیال سے مدینہ منورہ کی حاضری کے لیے چلے گئے۔ ہم معلم صاحب کی دھوکہ بازی میں آکر مکہ معظمہ چلے آئے اور عمرہ کیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ اور پھر واپس آکر حج کیا۔ میرے بیان کرنے میں واقعات آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔ عمرہ اور حج کا بیان میں نے ساتھ ساتھ بیان کردیا ہے۔ اُسکے بعد مدینہ کا حال لکھا ہے جیسے آم کھانے میں جو آم سب سے مزے کا نکلتا ہے اس کو سب کے بعد کھانے کے لیے لوگ رکھ لیتے ہیں۔ مکہ معظمہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ کتنی اس میں رعب خداوندی سے تھی اور کتنی سب لوگوں کو اس عالم میں دیکھ کر بہ تکلف مومنیت پیدا کرنے کی تھی یہ میں نہیں بیان کرسکتا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ زیادہ تر تصنع کی تھی۔ گویا میں بہ کوشش

اپنے اوپر رعب خداوندی طاری کر رہا تھا۔ حرم پاک میں پہونچ کر یہی حالت بہت بڑھ گئی۔ طواف کیا۔ حجر اسود کے بوسے دیئے۔ سعی کی۔ قصر کروایا اور احرام کھول ڈالا۔

بھائی مٹھو میرے قدیم خدمت گار اور دلی ہی خواہ۔ جوانی کے رازدار اور بڑھاپے کے یار غمگسار نے حرم میں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا "جو کچھ میں نے تمہارا کھایا پیا ہو وہ معاف کر دو۔" میں کچھ دست پاچہ سا ہو کر رہ گیا اپنے گناہوں کے خیال سے کانپ گیا اور مٹھو کی فراست کا بھی قائل ہو گیا۔ میں نے کہا میں نے معاف کیا اور میرا خدا معاف کرے۔ اُس گھڑی البتہ مجھ کو رعب خداوندی کا جو احساس ہوا وہ اب تک سب سے زیادہ تھا۔

اس جگہ اللہ میاں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا ربط کچھ دور آگے چل کر شاید مل جائے۔ میرے مرشد اور پیر کرامت حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ وجود باری تعالیٰ کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وجدانی دلائل بہت سے ہیں مگر عقلی نہیں۔ "عرفتُ ربی بفسخ العزائم" انہیں دلیلوں میں سب سے روشن دلیل ہے۔ ان کے فرمانے سے میں بھی یہی کہنے لگا اور آج تک وہی حال ہے۔

میرے دل میں وجدانی دلیل جو سب سے زیادہ دل نشین ہوئی وہ خود میرے اوپر گزری ہوئی ہے۔ میں گھوڑے پر سے اکثر گرا میرا تجربہ ہے کہ جب میں گرنے لگا تو گرنے کے دوران میں تمام پچھلے کی افتادگیاں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ اسی طرفۃ العین میں میں نے ہر بار کہا "محمد علی پہلے تم بچ گئے مگر ابکی ایسے جا رہے ہو کہ بچنا ناممکن ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آتا رہا کہ ممکن ہے بچ جائیں۔ یہ بچ جانے کی امید کہاں سے

آئی ہو ممکن ہے گذشتہ تجربوں کی بنا پر آئی ہو۔ لیکن مادی پہلو سے نظر کرتے ہوئے اور اسباب و علل کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہوں تو پوری طرح یہ اعتراض دل پر جمتا نہیں۔ کیونکہ صحیح یا غلط اس وقت نہ بچنے کا یقین تو دل میں تہ نشیں کردہ تھا۔ پھر یہ بچ جانے کی آس کہاں سے لگی تھی۔ گذشتہ تجربہ کی بنا پر اس وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دل کو یقین تھا کہ اب کی بار کا گرنا گذشتہ گرنے سے مختلف ہے۔ اور اس مرتبہ گر کر بچ جانے کا تجربہ آئندہ ہونے والا تھا۔ اور ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ پھر یہ امید کہاں سے بندھی کہیں یہ بات تو نہ ہو کہ علاوہ مادی چیزوں کے آدمی میں کوئی چیز اور ہو جسکو ”امداد ربی“ کہتے ہیں۔ اور اُسے کچھ ایسا علم ہو جس کی خبر مادی جسم کو نہ ہو یہی ”بے دلیل کی دلیل ہے“۔ جس پر میں اپنا شمار اللہ کے ماننے والوں میں کرتا ہوں۔ بار الٰہا۔ تو بھی کرا ور اس سیاہ دل میں ایک روشنی کی کرن بھیج دے آمین۔ رب العالمین۔ مانگتے تو ہیں۔ دینے نہ دینے کا اختیار دوسرے کو ہے۔

زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست   تا در میانہ خواستہ کردگار چیست

وجود باری تعالیٰ کی بحث ایک نئی امریکن کتاب میں ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "man does not stand alone – By cressy morrison" تقویت ایمان کے لیے اس کو بھی لکھے دیتا ہوں۔ کتاب اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس کا مفہوم ایک بیاض میں ٹانک لیا تھا۔ پیش کرتا ہوں۔ صفحہ ۵ پر ہے۔

”تمہاری آنکھ کا شیشہ آنکھ کے پردے پر سایہ ڈالتا ہے۔ اور اعصاب سایہ کو درست کر دیتے ہیں کہ ٹھیک تصویر پردے پر اُتر آئے۔ اُس پردے میں نو پرت ہیں۔ تمام پرتوں کی دبازت مل کر معمولی کاغذ کی موٹائی بھر ہو گی۔

آخری پردہ جو ہے وہ مخروطی اور نلکیوں کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ اس میں تین کروڑ گلیاں اور تین لاکھ مخروطی شکلیں ہیں۔ پہلے تصویر الٹی اترتی ہے۔ اُس کو دماغ تک سیدھی کر کے پہونچانے میں لاکھوں اعصاب کام کرتے ہیں۔ گرمی اور روشنی الگ دکھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ تب جا کر صحیح چیز دکھائی دیتی ہے۔ اگر اُن میں سے ایک جز بھی نکال ڈالا جائے تو آنکھ دیکھ نہ سکے۔

یہ سب ازرُوے ارتقا کیسے ہو گیا۔ ذرا مشکل سوال ہے۔

صفحہ چوبیس۲۴ پر ہے۔

"آکسیجن کو لے لیجئے۔ اُس کا حساب تعجب خیز انداز سے بیٹھتا ہے۔"
جو میں آکسیجن۔ نائٹروجن۔ آرگنیس نی ان۔ زینن اور کرپٹن گیسیں ہیں۔ پانی بھی خفیف سا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ دس ہزار حصوں میں تین حصے ہوگا بہت کم مقدار میں اور گیسیں بھی ہیں جو آگ یا بجلی دکھانے کے کام میں آتی ہیں۔ نائٹروجن تقریباً اٹھتر فی سیکڑا ہے اور آکسیجن اکیس فی سیکڑا ہے۔ باقی ایک سیکڑے میں اور گیسیں ہیں۔ سمندر کی سطح کا حساب لیتے ہوئے پورے روے زمین کی سطح پر ایک انچ پر پندرہ پونڈ کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس میں آکسیجن بھی شریک ہے۔ باقی آکسیجن مٹی میں دبی ہے اور یہ ابتک مصرف میں نہیں آئی ہے اور یہ $\frac{۸}{۹}$ حصہ پانی کا تیار کرتی ہے۔ آکسیجن ذی روح کی سانس کیلئے ضروری ہے۔ اور یہ صرف جو سے حاصل ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف اُسی قدر آکسیجن جو میں رکھی گئی ہے جو انسان کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ کیسے ہوا۔ اگر بجائے اکیس سیکڑا ہونے کے فرض کیجئے۔ یہ پچاس سیکڑا ہوتی۔ تو ہر چیز جل اُٹھتی۔ پھر فرض کیجئے یہ کم ہوتی۔ دس سیکڑا کہہ لیجئے تو دنیا میں آگ نہ رہ جاتی۔ اگر خود یہ آکسیجن مٹی میں دبی ہوئی آکسیجن سے مل جائے

تو بھی حیات نہیں رہ سکتی۔ نباتات کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ گیس نباتات سے حیوان کو ملتی ہے اور حیوانات سے نباتات کو۔ ان تمام چیزوں پر حیات کا دارومدار ہے۔ یہ سب چیزیں کیسے اسی مناسبت سے آگئیں جس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ $\frac{1}{1000000}$ ایک بٹا دس لاکھ بھی اتفاق نہیں ہو سکتا کہ گیسیں ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے آگئیں جو زندگی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اگر کہا جائے اتفاق سے ہو گیا تو گویا ریاضی کو پس پشت ڈال دیا۔ وان من شیئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ

الا بقدر معلوم[عہ]

اتفاق کا حساب سمجھنے کے لیے دس پیسوں پر چاقو کی نوک سے ایک سے دس تک سلسلہ وار گنتی لکھ جائیے۔ دسوں پیسوں کو ملا کر جیب میں ڈال لیجیے۔ اب کوشش کیجیے کہ پہلے نمبر ایک نکلے۔ $\frac{1}{10}$ امید ہے کہ ایک نمبر کا پیسہ نکل آئے۔ جب نکل آوے تو پھر وہ پیسہ جیب میں ڈال لیجیے۔ اب کوشش کیجیے نمبر ۲ پیسہ نکل آوے۔ اس بار $\frac{1}{100}$ امید ہے کہ نکل آوے۔ اس کو پھر جیب میں ڈال لیجیے اب کی نمبر ۳ پیسہ نکالنے کی امید $\frac{1}{1000}$ رہ گئی۔ دس تک پہونچتے پہونچتے کروڑوں اور اربوں کا حساب آ کر بیٹھے گا۔ حضرات ازروئے ریاضی اتفاق سے زیادہ ٹھیک اڑنے والی دوسری چیز ہے نہیں۔ اب دہریت کے طرفدار ذرا غور فرمائیں کہ تمام گیسوں اور آنکھ کا مکمل نظام یہ سب اتفاق سے ہو جانا ازروئے ریاضی قیاس سے کتنا بعید اور گدھے پن سے کتنا قریب ہے۔

چیونٹیوں کے حال میں ایک کتاب پڑھی تھی کہ جب ان کی مختلف ٹولیوں میں لڑائی ہو چکتی ہے تو فاتح گروہ اپنے کشتوں کو دفن کرتا ہے اور غنیم کے

[عہ] سورہ حجر آیت ۲۱ - تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں مگر بقدر معلوم ہم انھیں اتارتے رہتے ہیں

کشتوں کو نہیں دفن کرتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علاوہ انسان کے جانوروں میں بھی دوسرے عالم کا خیال ہے۔

اب پھر اپنے حال کی طرف عود کرتا ہوں کہ تقیہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ میں نے کیا۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

چونکہ میری مرحومہ بی بی سُنّی تھیں اور چونکہ انھیں کے قدموں کی برکت سے مجھے حج نصیب ہوا تھا۔ اس لیے میں بھی سُنّی معلم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ اور زیادہ تر طواف سُنّی ہی معلم کے ساتھ کرتا تھا۔ دونوں فرقوں کی کتابیں دیکھیں دونوں معلموں کے ساتھ طواف وغیرہ کیا۔ مجھ کو تو یہ پتہ چلا کہ اگر وہ امور جن کا نام مستحبات رکھا گیا ہے نکال ڈالے جائیں تو کچھ زیادہ فرق نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اس راز سے واقف نہیں پایا۔ کیونکہ کوئی ہمارا ایسا ذہل کُل یقین حاجی تھا نہ کوئی دونوں سے واسطہ رکھتا تھا۔

اب دوسرے دن سے دل اور دماغ کی تباہ کاری شروع ہوئی۔

"یار محمد علی! اللہ میاں تو لامکاں ہیں۔ اُن کا گھر کیا اور اسلیے توبہ توبہ معاذ اللہ اجودھیا میں بھی سات چکر لگاتے ہیں۔" ان خیالات سے دل کانپ جاتا ہے اور اپنے جہنمی ہونے کا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ اللہ میاں سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگتا ہوں کہ میرے پروردگار مجھ کو سنبھال لے۔ میرے اوپر رحم فرما۔ مجھ کو شیطانی وسوسوں سے بچالے۔

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

معلوم نہیں کہ میرا نام دفترِ اسلام سے خارج کر دیا گیا یا ارحم الرحمین نے باقی رکھا۔ پھر دل میں خیال گذرا کہ کہیں حجر اسود کو بوسہ دینے کا تو یہ اثر نہ ہو۔ حجر اسود

کے لیئے یہ مشہور بھی ہے کہ آدمی کی اصلیت کو اوپر نکال لاتا ہے۔ اور کھول دیتا ہے۔ حجر اسود تو خیر بڑی چیز ہے اس سے بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جو واقعی بُری ہیں۔ آدمی کی اصلیت کو کھول دیتی ہیں۔ دولت کو دیکھیئے۔

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

اس سے بھی بُری چیز شراب ہے۔ کسی کو شراب پلا دیجئے۔ اصلیت معلوم ہو جائیگی۔ میں نے لوگوں کو ذرا سے سرور میں آیات قرآنی کی تلاوت کرتے سُنا ہے۔ اور دیکھا ہے۔ میں نے شرابیوں کو صرف ذرا سی پی لینے میں خدا سے توبہ کرتے اور گناہ کے خیال سے روتے دیکھا ہے۔ زیادہ پینے والا تو اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اس کا ذکر نہیں۔ میں نے یہ حالتیں تھوڑی سی پی لینے میں دیکھی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا ہے کہ گھونٹ گلے سے اُترا نہیں اور فحش کی بھرمار ہو گئی غیبت کا طومار بندھ گیا۔ کسی کمینے کو برسر حکومت کر دیجئے۔ پھر دیکھیے میرے خیال میں یہی حال میرا بھی ہوا۔ میری چھپی برائیاں تھیں عود کر آئیں۔ اگر شاید کہیں کوئی پڑی پڑائی اچھائی بھی رہی ہو گی تو وہ بھی اوپر آ گئی ہو گی۔ مگر اتنا تو میرے تجربہ میں آیا ہے کہ شیعہ سنی سے میں ہمیشہ پریشان رہا۔ بہت سی باتوں کا مُنہ سے نکالنا کیسا دل میں سوچتے ڈرتا تھا۔ مگر حجر اسود کا بوسہ دینے کے بعد بالعلم کُھلا کہنے لگا۔ اب حجر اسود کے بوسہ کے بعد یہی اثر غیر مسلم پر ہو گا کہ نہیں؟ از روئے نفسیات نہ ہو تو تعجب نہیں۔ میں خود اس مسئلہ کی ابتدا تک ۔ از روئے نفسیات پہنچ سکا نہ از روئے اعتقاد۔ میرے ساتھیوں میں سے ایسے بھی تھے جو ابھی بی بی سے کہہ اُٹھتے تھے "تم ہی نے ہم کو اس آفت میں ڈالا ہے۔ اب یہاں سے ہماری لاش جائیگی۔ ہم کو صرف

موت کا دھڑکا رہتا تھا۔ ورنہ کوئی اور بات اس طرح چھپانے کی اگر رہی بھی ہوگی تو بہت کم۔ نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگ کر فرحت ہوتی تھی دل باغ باغ ہوتا تھا۔ دل میں نیکیاں آتی تھیں۔ انشراح قلب ہوتا تھا اور وہی آرزو بڑھتی جاتی تھی کہ مرنے کے پہلے مدینہ کی زیارت ہو جائے

ایک دن کا قصہ سنیئے۔ میں جو حرم میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کعبہ شریف کا دروازہ کھلا ہے بے اختیار دوڑ پڑا۔ مگر مجمع اس قدر تھا کہ لکڑی کی سیڑھی جو لگا دی گئی تھی اور جس کے ذریعے سے لوگ بیت اللہ میں داخل ہوتے تھے اس پر نہ چڑھ سکا اور مایوس لوٹ آیا۔ پھر ایک دن اسی طرح کا اتفاق ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ آج میں نے ارادہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو انشاء اللہ تعالیٰ اندر ضرور جاؤں گا۔ اور دیوانہ وار پہونچ ہی گیا۔ وہاں دیکھا کہ کلید بردار صاحب جن کا اسم شریف شیبی تھا دروازے کے پاس ایک صندوق سی چیز پر بیٹھے ہیں۔ اور ایک آدمی آب زمزم لیے کھڑا ہے۔ انہوں نے مجھ کو دیکھتے ہی نذر مانگی۔ میں نے ایک چاندی کا سکہ تلے اوپر ہاتھ رکھ کر پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا: ''معمولاً لوگ کچھ پیسے دیتے ہیں۔ میں نے تو خوشی میں روپیہ پیش کیا۔ یقیناً وہ سمجھ گئے کہ یہ بیوقوف ہے اس لیے دو مانگے میں نے دس کا نوٹ نکالا اور آٹھ روپے واپس مانگے۔ انھوں نے فرمایا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے آدمی کے پاس تھیلی میں کافی مال تھا۔ میں نے وہ نوٹ اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا کہ عطوہ رقم آپ کے دولت خانہ پر آکر دے جاؤں گا۔ یہ صاحب پہلی لڑائی میں بھاگ کر قید ہو کر ہندوستان آئے تھے اس لیے اردو سمجھتے تھے۔ بڑی عنایت سے فرمایا ''دو دو نفلیں چاروں طرف پڑھو۔ چنانچہ میں نے پڑھیں وہاں

پہونچ کر ضرور میرے دل میں ایک حالت پیدا ہوئی۔ کچھ ناز، کچھ فخر، کچھ مباہات، کچھ یہ شکر کہ اللہ نے اپنے اس گنہگار بندے کو یہ مبارک دن دکھایا رعب خداوندی کی کیفیت کم تھی۔ بجائے اس کے کچھ اس قسم کی کیفیت تھی جو غالب نے بیان کی ہے

ہر اک قطرے میں ہے ساز انا البحر ÷ ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ چنانچہ "و ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم"۔ ایک صاحب مجھ سے بالکل ملے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ دیوار سے چھوٹ کر ایک کنکری ہمارے سامنے گری تھی۔ اُنھوں نے اس کو اُٹھا کر جیب میں رکھنا چاہا۔ یقیناً اس لیے کہ اپنے ساتھ قبر میں رکھنے کی وصیت کر جائیں گے میرے دل میں خیال آیا یہاں بھی یہ حرکت۔ اس وقت میں تشہد پڑھ رہا تھا۔ مگر بے اختیاری میں میرا ہاتھ زانو پر سے سیدھا ہو گیا۔ اور اُن غریب نے کنکری چھوڑ دی۔ یہ فعل بالکل اضطراری ہوا۔ اور نہ پھر اُنھوں نے کچھ کہا۔ نہ میں نے۔ خدا مجھ کو معاف کرے۔ خانۂ کعبہ کے اندر سُنا تھا کہ اوپر کی طرف نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ یہ غرور کی نشانی ہے۔ مگر اس وقت غرور کا تصور کہاں تھا۔ ہم تو دوسرے رنگ میں تھے۔ دل نے کہا اگر بچہ زانوں پر پیشاب کر دیتا ہے تو باپ کب خفا ہوتا ہے ہم تو اوپر دیکھیں گے۔ چنانچہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ دیکھا کہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک سلاخ لگی ہے جس میں سیکڑوں برتن۔ خاصدان و دودھ دان۔ کشکول وغیرہ کے ایسے لٹکے ہیں۔ یہ سب چاندی بلکہ زیادہ تر سونے کے ہیں۔ میں نے شیبی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا مجھ کو نہیں معلوم۔ یہ ہمیشہ سے اسی طرح لٹکتے چلے آئے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے کہا کہ فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلعم نے کنجی ہمارے

مورثِ اعلیٰ کو دی تھی اس وقت بھی یہ برتن ایسے ہی تھے۔ میں اکیس برس کی بات ہے مگر جہاں تک یاد ہے انھوں نے یہی کہا تھا کہ کعبہ کی اندرونی دیوار میں اُلٹے سیدھے ٹکرے پتھر کے لگے ہیں جنمیں بعض بعض میں یونانی طرز کے نقش و نگار کا پتہ چلتا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے جب کعبہ پھر سے بنوایا تھا اُسی زمانہ میں ساحل پر کوئی یونانی جہاز تباہ ہوا تھا اور یہ پتھر اسی میں کے ہیں۔ یہ کسی نظام کے ماتحت نہیں جڑے ہیں۔ بلکہ بے ترتیب یونہی اُلٹے سیدھے لگا دیئے گئے ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی قابل ذکر ہے۔ جس رات کو میں حج کے جانے کے اوپر متفکر تھا۔ میرے عنایت فرما خان بہادر محبوب حسین خاں مرحوم فیض آبادی اتفاق سے مجھ سے ملنے آگئے اور اُنھوں نے یہ صلاح دی کہ میں ضرور حج کو چلا جاؤں۔ اور میرا تذبذب دور کردیا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ چنانچہ میں انھیں کی کار پر لکھنؤ گیا۔ راستہ میں اُنھوں نے کہا کہ "تمھاری لاادریت اور فلسفیانہ الحاد سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن پھر بھی ایک بات گوش گذار کیئے دیتا ہوں کان میں پڑی رہے۔ اُنھوں نے کہا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی صاحب العصر علیہ السلام حج میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر کسی خوش نصیب مومن کو ان کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھنا۔" آگے چل کر میں اس مسئلہ پر اپنے خیالات بیان کروں گا اس جگہ پر صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ یہ میرا عقیدہ نہیں ہے۔ اب قصہ سنیئے۔ ایک شام کو شاید ساتویں ذی الحجہ تھی یا اور کوئی تاریخ مغرب کی نماز پڑھ کر حرم میں بیٹھا تھا کہ مجھ کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ کسی سے پوچھ کر میں رفع حاجت کے لیے گیا۔ وہاں سے نکل کر مجھکو یہ سب کچھ کا اندازہ نہ رہ گیا۔ چار سو گز لمبا اور تقریباً تین سو گز چوڑا حرم بیت اللہ ایسے

چاروں طرف ایک طرح کی عمارتیں۔ متحیر کھڑا تھا کہ ہمارے ساتھی کس طرف بیٹھے
ہیں اور میں نے اپنا جوتا کہاں رکھا ہے۔ اتنے میں ایک صاحب عربی لباس
میں اور واقعی نورانی صورت کے میرے پاس تشریف لائے اور اچھی خاصی اُردو
میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کس کی تلاش میں ہیں۔ میں نے حال بیان کیا
انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا۔ "تمھارے ساتھی اس طرف بیٹھے ہیں"
میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُن بزرگ کا ہاتھ معانقہ کے بہانہ سے خوب مضبوطی سے
دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور دریافت کیا کہ حضور کون بزرگ ہیں۔ انھوں نے کہا
"میرا نام خیاط ہے" (شروع کا حصہ نام مجھے یاد نہیں) اور میں ایک معلم
ہوں۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے کپڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ
لکھنؤ کے ہیں اور بعد اتھادر سکندر کے حاجی معلوم ہوتے ہیں
اب میں ان کا ہاتھ اسی طرح پکڑے ہوئے اور سوچ رہا ہوں، جوتا گیا
اپنی ایسی تیسی میں اور ساتھی گئے بھاڑ میں۔ ہم کو اگر یہ سعادت خدا
نصیب کرے تو پھر کسی چیز کی پروا نہیں۔ اب میں جلدی جلدی خیال
دوڑا رہا ہوں کہ امام ہمام کے اس کلام میں توریہ تو نہیں ہے۔ اور وہ
بزرگ چپ کھڑے ہیں۔ آنکھوں کی ذہنیت بھی عجز و مجبوری سے۔ جبکہ امام وقت
کے غائب ہوئے تھے تو میں ایک درجہ بھی یقین نہیں ہے جبکہ سوا سیکڑوں
برس [illegible] ہے اور یہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ توریہ جس کے معنی [illegible]
[illegible] ہے جس سے [illegible] [illegible] اور زبان کے شایانِ شان [illegible]
نہیں ہو سکتا مگر مجبوری تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ان بزرگ کا ہاتھ نہیں
چھوڑتا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو مجبوراً چھوڑ دیا۔ اب
[illegible] کا حال ختم ہوا۔

عرفات میں جہاں تک مجھ کو یاد ہے میری حالت اچھی رہی الحمدللہ رب العالمین۔ راستہ کا ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ دھوپ بڑی تیز تھی ہم لوگ منیٰ سے عرفات جا رہے تھے۔ ایک بوڑھے میاں بی بی ہندو بھی بھی لبیک پکارتے ہوئے قافلہ کے ساتھ تھے۔ بی بی اونٹ پر اور میاں پیدل۔ بی بی سے کسی بات پر بگڑ گئے۔ ایک دم ٹھنک گئے۔ کہنے لگے بس ہم واپس جاتے ہیں۔ تمہارے اوپر ہم نے چھوڑا حج۔ اس کا عذاب تمہاری گردن پر۔ بوڑھیا منہ پر ہاتھ رکھے کھسیانی مسکراہٹ الگ مسکرا رہی ہے۔ قافلہ والے الگ ہنس رہے ہیں۔ اور بڑے میاں ہیں کہ منیٰ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ لوگوں نے بہت خوشامدیں کیں۔ تب بڑی مشکل سے من گئے۔ معلوم نہیں دوسرے اسے کیا کہیں گے۔ مگر مجھ کو تو یہ ادا بڑی اچھی لگی۔

عرفات میں جائے ضرور کے لیے ایک قنات میں نے الگ لگوائی تھی۔ مگر کون مانتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عام پبلک ہو گئی۔ ایک صاحب کو ضرورت گاہ جا رہا تھا۔ میں نے روکا۔ شاید میری آواز میں خفیف سی سختی تھی۔ اُس نے بھی سختی سے جواب دیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ بعد کو مجھے خیال آیا ارے کمبخت عرفات میں بھی یہ غضب تو نے کیا۔ دوڑا گیا اور بڑی لجاجت سے اس آدمی سے معافی مانگی۔ اس بندۂ خدا نے بڑی فراخدلی سے معاف کر دیا۔ اس کے مالک نے بھی معاف کیا۔ اللہ میاں غفور الرحیم ہیں۔ میں نے دل سے معافی مانگی تھی۔ مگر وہاں کا حال تو وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا۔ عرفات سے منیٰ کی واپسی میں دل بہت خوش تھا۔ پانی برس جانے سے موسم بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ اتنی بڑی نعمت حاصل ہونے سے اطمینان سا تھا

اپنے اعمال تو جیسے ہیں ظاہر ہی ہیں۔ مگر اس وقت خدا کے رحم کا خیال اس کے انتقام اور اُس کے قہر کے خیال پر بہت غالب ہو رہا تھا۔ ہم لوگ اونٹوں پر منیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ایک اونٹ پر دو دو شغدف ہیں۔ شغدف میں ایک طرف میری بی بی مرحومہ اور دوسری طرف میں ان کی طرف تھوڑا سا اسباب رکھ کر وزن برابر کر لیا گیا تھا کہ کجاوہ ایک طرف جھک نہ جائے۔ جنہوں نے شغدف نہ دیکھا ہو ان کے لیے عرض ہے کہ شغدف دو چھوٹے چھوٹے بے پایوں کے کھٹولے اونٹ کی پیٹھ پر اِدھر اُدھر لٹکتے ہوتے ہیں۔ اب یہ لٹکے ہوئے کھٹولے برابر کیسے ہوں کہ آدمی اُن پر بیٹھ سکے۔ اس کی ترکیب حسب ذیل ہے۔ یہ سمجھ لیجئے جیسے ایک کھانچی یا بڑے ٹوکرے کو بیچ سے کاٹ لیجئے۔ اور ان آدھوں کو کھٹولے کے باہری پایوں سے باندھ دیجئے۔ اب کھٹولے اونٹ کی پیٹھ پر ہیں اور یہ آدھے باہری کی پٹیوں سے بندھے ہیں۔ لٹکے ہوئے کھٹولوں کو برابر کیجئے اور کھانچیوں کے باہری حصوں کو ایک رسی سے آپس میں اونٹ کی پیٹھ کے اوپر باندھ دیجئے۔ اب جب تک یہ رسی ٹوٹ نہ جائے آپ آرام سے بیٹھے چلے جائیے۔ اگر خدا ناکردہ رسی ٹوٹ گئی تو خدائے عزوجل کا قاعدۂ ثقل و کشش عمل پیرا ہوگا۔ اور ایک طرف دونوں کھٹولے گر پڑیں گے۔ اب تو یہ انشاء اللہ چوٹ کم آئے گی مگر گر پڑیں گے ضرور۔ اونٹوں کی قطار میلوں تک گئی ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ جو اونٹ ہمارے آگے تھا۔ اس سے کچھ اردو میں بات چیت کی آواز سنائی دی۔ میں نے اونچی آواز کر کے اُن کو مخاطب کیا۔

میں۔ آپ تو ہمارے دیس کے معلوم ہوتے ہیں۔

وہ۔ جی ہاں، آپ کہاں رہتے ہیں

میں۔ لکھنؤ کے جوار کا رہنے والا ہوں۔

وہ۔ میں بھی لکھنؤ میں رہتا ہوں۔ مولوی گنج میں۔

میں۔ میں ردولی کا رہنے والا ہوں۔

وہ۔ خوش ہو کر۔ اہا۔ آپ ردولی کے رہنے والے ہیں۔ وہاں عرس میں ہمیشہ حاضر ہوتا ہوں۔

میں۔ جی! سجادے صاحب بھی تو تشریف لائے ہیں۔

وہ۔ (خوش ہو کر) حیات میاں صاحب۔

میں۔ جی نہیں۔ افتخار احمد صاحب۔

وہ۔ (بے پروائی سے) ہوں۔ ہوں۔

میں۔ (اپنے دل میں) سجادہ نشین تو دونوں ہیں۔ خالی امیری اور غریبی کا فرق ہے۔ یہ محبت تو حضرت احمد عبدالحق قدس سرہ سے نہ ہوئی۔

وہ صاحب۔ اور میں تمام آستانوں پر حاضر ہو چکا ہوں۔ کلیر شریف۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔

جیسے ہی ان صاحب نے کلیر شریف کہا اوپر والی رسی ٹوٹ گئی، صف اڑا اڑا دھڑام۔ دونوں بزرگوار غٹ پٹ۔ میرا مارے ہنسی کے یہ حال کہ اتنی سانس نہیں جو جمال کو پکاروں۔ صف اُلٹی جاتی ہے۔ نیچے کے اونٹ آگے اور آگے کے پیچھے اور میں ہنسی کے مارے بے بس۔ بی بی الگ پریشان کہہ رہی ہیں "ہائیں! ہائیں! وہ بیچارے گر پڑے ہیں اور تم غضب خدا کا ہنس رہے ہو" میں جمال کو پکارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر ہر بار "جما! ہی ہی! ہی ہی! جما! ہی ہی! ہی ہی" ہو کر رہ جاتا ہے۔ پیٹ میں سانس سماے تو آواز بھی نکلے۔ وہاں یہ حال کہ [illegible] دونوں لڑ رہے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں اللہ اپنے ملک پہ رحم

کہاں لدے پڑتے ہو۔ دوسرے صاحب فرما رہے ہیں "ارے یار کیا کریں۔ ذری سنبھلنے دو" اور ہم ہی ہی ہی کے دریائے ناپیدا کنار میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ خیر خدا خدا کرکے منہ سے آواز نکلی۔ جمال بھی آیا۔ ٹانگا کھولا گیا۔ دونوں رونے والے علیحدہ کئے گئے۔ جوش عقیدت میں حاجی صاحب گرد جھاڑ جھاڑ کر فرمانے لگے "دیکھو۔ بزرگوں کے نام کی برکت دیکھو۔ اتنے اونچے سے گرے اور چوٹ بالکل نہ لگی" ہم نے ہی ہی کے دریا میں پھریری کی کھائی۔ یہ واقعہ میں نے یوں ہی نہیں عرض کیا ہے اس سے ایک سبق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بچپن کی عادت "کلا بل ران علیٰ قلوبہم ما کانو یکسبون" ہم شیعہ آدمی۔ ہنسی کے مارے لوٹ ہو گئے کہ منیٰ اور مزدلفہ کے بیچ میں بھی خدا اور رسول کے بجائے صرف بزرگوں کا نام مدد کو پہونچا۔ اور ہماری بی بی کی نظر صرف دو انسانوں کی تکلیف پر گئی۔ منیٰ کے صرف دو واقعات جن کا اثر مجھ پر ہوا بیان کرتا ہوں،

ایک قربانی: قربانی کے عظیم مسئلہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ گوشت خور ہوں۔ اس لیے شاید میں صحیح آدمی بھی نہیں جو اس پر رائے رکھتا ہو۔ اکیس برس ہوئے جب میں گیا تھا۔ اس وقت کھالوں اور گوشت ذخیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک حاجی نے کچھ گوشت اپنے واسطے لیا۔ اس کو ایک ران مع کھال کے کاٹ کر دیدی گئی

دوسری بات رمی جمرات ہے۔ مجھ کو اس کی ظاہری حکمت نہیں معلوم۔ خود میری موٹی عقل میں یہ آتا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا تبرا ہی ہوگا۔ تین بھوت بنے ہوئے ہیں۔ ان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ جہلا کی زبان میں یہ بڑا

شاید یہ شیطان ان کے وجود پر سنگ لگ گئے ہیں جنھوں نے قتل کیا تھا۔

شیطان۔ مجھلا شیطان۔ اور چھوٹا شیطان کہلاتے ہیں۔ شیطان سے بریت چاہنا اور اس بریت سے جو نفرت پیدا ہوگی وہ اس نفرت سے بالکل علیحدہ ہے جو کسی انسان سے نفرت کرنے سے ہوگی۔ نفرت یا رغبت کا اچھا یا بُرا اثر جو ہو سکتا ہے وہ خود مادی جسم رکھنے والے سے نفرت یا رغبت کرنے سے پیدا ہوگا۔ شیطان جس کا وجود ہمارے لیے غیر مادی وجود سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس سے نفرت کرنے یا بریت چاہنے سے کوئی کینہ یا بغض ایسا نہیں پیدا ہو سکتا جو کسی دوسرے مادی انسان یا حیوان کو نقصان پہونچائے۔ اور اس طرح خود ہمارے نفس کو نقصان پہونچا سکے۔ اگر بجائے شیطان کے یہ کنکریاں مثلاً اگر ابولہب نمرود۔ یا فرعون سے نام کے ماری جائیں تو چونکہ وہ لوگ بھی انسان ہی تھے اس لیے ہمارے دل پر ایک دوسری طرح کا اثر مترتب ہوتا جس میں اپنے ہم جنس سے نفرت پیدا ہونے کا امکان تھا۔ نفرت آدمی کے فعل سے ہونی چاہیے۔ انسان سے نہ ہونی چاہیے۔ اگر بُرے آدمی سے ہی نفرت کرنے کی عادت ڈالی گئی ہے تو یہی خود ہمارے دل پر ایسا اثر ڈال سکتی ہے جو ممکن ہے ہمارے نفس کو نقصان پہونچائے۔ نفرت خدا نے پیدا کی ہے اور اس کا بھی کچھ صحیح مصرف ہے۔ جیسے قاضی کو جرائم سے ہوتی ہے اس نفرت سے قاضی کا نفس منزہ ہو کر اور زیادہ شریف ہو جاتا ہے لیکن اگر قاضی سزا کا حکم دینے کے بعد اسی حکم کو وظیفہ بنا لے تو قاضی کا نفس بجائے شریف ہونے کے سیاہ ہو جائے۔

مولانا روم علیہ الرحمہ نے ”او خیو انداخت بر روئے . . . علی“ والی نظم میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ اس مسئلہ پر بھی ایک پہلو سے خوب روشنی

---

[1] جناب ابراہیم اور شیطان کے واقعات احادیث میں ملاحظہ ہوں۔

ڈالتا ہے۔ واضح رہے کہ میں تحقیقی مسائل نہیں بیان کر رہا ہوں۔ بلکہ صرف اپنے احساسات لکھ رہا ہوں کہ مختلف چیزیں جو دنیا میں میرے ایسے کم عقل و کم فہم کے سامنے آئیں ان کا کیا اثر اس گنہگار معرفت کے خواستگار پر ہوا اور کیا وجہ ہوئی کہ اس عاصی کا رویہ تمام راستوں سے کچھ ہٹ سا گیا۔

منیٰ کی واپسی کے بعد مکہ معظمہ پہونچ کر طواف اور سعی کے علاوہ شیعوں کے یہاں ایک طواف نساء اور کرنا ہوتا ہے۔ یعنی آخری طواف کے بعد آدمی احرام سے باہر ہو جاتا ہے۔ مگر زنی بی حلال نہیں ہوتی۔ جبتک طواف نساء نہ کر لیا جائے۔ گو بہت سی باتوں میں اختلاف تھا مگر تھا تو میں شیعہ ہی اسلئے ایک شیعہ معلم ڈھونڈھ نکالا کہ طواف نساء مع تمام فرائض کے کروں تاکہ میری شریک زندگی پر کسی طرح کا حرف میرے شیعہ برادران کی طرف سے نہ آسکے۔ ان بزرگوار نے طواف کرایا۔ اس کے بعد سعی کی ٹھہری۔ اس میں ذرا لمبی دوڑ ہے۔ اور معلم صاحب ادھیڑ عمر کے کچھ موٹے تھے۔ وہ تو اکثر دیکھتے ہی تھے کہ میں سنی معلم کے ساتھ بھی طواف وغیرہ کیا کرتا ہوں۔ نماز بھی انھیں کی جماعت میں پڑھا کرتا ہوں۔ اس لیے کہنے لگے "میں تمھاری نیت ٹھیک کرائے دیتا ہوں۔ تم سعی سنیوں کے ساتھ کرو" مجھ کو اس میں کوئی ہرج نہ معلوم ہوا۔ اب جو وہ نیت کروا رہے ہیں تو کیا سنتا ہوں کہ بجائے عربی کے صرف فارسی میں کروا رہے ہیں اور کوئی فرق نہیں۔ میں نے ان سے کہا: "سنیئے صاحب۔ نیت ارادۂ دلی ہے جس کا اعادہ زبان سے ہو۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں۔ نیت تو عربی میں کروں گا جو میرے پیغمبر کی زبان ہے۔ یا پھر اردو میں کروں گا جو میری دل کی زبان ہے۔ یہ فارسی میں کس رشتہ سے کروں۔" بیچارے شرمندہ ہوئے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اس بات پر میری نظر بہت دنوں سے جایا کرتی تھی

کہ شیعہ سنی کے اختلافات اسی طرح کے لاطائل ہوا کرتے ہیں۔ جہاں ٹنگی اٹا یا عمامہ و کفش۔ یا پائجامہ ٹخنی وار آگیا بس خدا کے واسطے کو شیعہ سنی لنگوٹ کس کے کھڑے ہوگئے۔ نماز روزہ نکاح وغیرہ میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ مگر جہاں ان حضرات علماء کا قدم درمیان میں آگیا۔ بس حالی مرحوم کی آواز کانوں میں گونج گئی ؎

مذہب کو توڑ ڈالا کافر بنا بنا کر   اسلام مولویوں نے ہی ہارا

اب ہم لوگ بیت اللہ سے رخصت ہوئے اور دربار رسول کی تیاری کی۔ مکہ معظمہ میں اپنے اوپر دو تین بار میں نے اچھا اثر محسوس کیا۔ جس دن پہلے حرم محترم میں میں نے دیکھا۔ جب خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوا حجر اسود کے بوسہ دیتے کہ جس کا اثر اشارۃً پہلے بیان کر چکا ہوں۔

تیسرا باب

اب مدینہ کا سفر شروع ہوا

سعدیا عبث احرام طوف مردہ می بندی
روئے یار ما گر کعبۂ صفا این است

اختلاج کہئیے یا مراق یا اپنے گناہوں کا خیال۔ وہ دھڑکا کہ مجھے روضۂ مقدس رسول صلعم کی زیارت نہ ہوگی برابر قائم ہے۔ قریب شام شہر پناہ پر پہونچا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے بخار ہے۔ یقین کامل ہو گیا کہ وہی بات جو دل میں شروع سے جاگزیں تھی پوری ہونے والی ہے یعنی بخار بڑھ جائے گا اور میں زیارت سے محروم رہ جاؤں گا۔ جس مکان میں ٹھہرایا گیا تھا وہ حرم رسول اللہ سے قریب ہی تھا۔ بعد مغرب خیال آیا کہ ابھی بخار تو زیادہ نہیں ہے۔ چلو اسی وقت زیارت کر آؤ۔ گو میں طاہر تھا اور نماز پڑھتا تھا مگر دل یہ چاہتا تھا کہ نہا دھو کر حاضر ہوں دربار کے لیے ایک انگرکھا جامدانی کا مسلمان دھوبی کا دھویا ہوا گھر ہی سے لیکر چلا تھا۔ بس میں اُسی بخار میں اٹھا۔ اندر تو نہیں گیا مگر باب السلام سے روضۂ مبارک کا سامنا تھا۔ دروازے کے باہر ہی سے سلام کیا۔ مختصر سی زیارت اپنے جی سے گڑھ کر پڑھی اور پھر گھر آگیا۔ وہ مارا ہے

عاشق زار من بیا بر در بارگاہ من
حد تو نیست ایں زماں کرم بجز الست

اسوقت تھوڑی دیر کے لیے بیماری اور موت سب بھول گیا۔ دوسرے دن کو

حرارت تھی مگر حمام کر کے حرم میں حاضر ہو گیا۔ ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

زیارت پڑھی اور جُٹ گیا نماز پڑھنے پر۔ کتابوں میں کچھ طریقے اور کچھ قاعدے سنت نمازوں کے اور کچھ نوافل کے دیکھے تھے۔ سفر میں اکثر وہ کتابیں دیکھتا گیا تھا۔ مگر وہاں پہونچکر کیسا قاعدہ اور کس کا طریقہ۔ دو دو رکعتیں آدمی شروع کر دیں، اسطوانۂ حرث پر۔ اسطوانۂ ابولبابا پر۔ اسطوانۂ حنانہ پر۔ ع

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اسطوانۂ عائشہؓ پر۔ روضۂ ریاض الجنہ۔ یہاں وہاں سب کہیں۔ ہر جگہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیں۔ آج تک جب کبھی نماز پڑھی تھی تو رکعتیں ہی گنا کیا تھا کہ اب ایک ختم ہوئی۔ اب دوسری ختم ہوئی۔ مگر حرم محترم میں پہونچکر نمازیں پڑھنے میں لطف آگیا۔ آپ سے وہ مزہ کیسے بیان کروں اگر آپ جانتے ہیں تو جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو کیسے سمجھاؤں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ

پڑ گیا لوٹ میں سرکار کا مہماں ہو کر

ایک دن اسطوانۂ عائشہ پر نماز پڑھ رہا تھا۔ ہمارے جوار کے پڑھے لکھے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی میرے قریب آئے اور مزاحاً کہنے لگے "آپ یہاں کیوں نماز پڑھ رہے ہیں؟" میں نے کہا "وہ جیسی بھی رہی ہوں۔ جن کی چہیتی بی بی تھیں وہ پاس ہی تشریف رکھتے ہیں۔ میرے باپ کی بھی مجال ہے کہ اس مقام کی سعادت نہ حاصل کروں؟" یہ واقعہ انھوں نے بھی اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ مفہوم یہی ہے۔ گو سلیقے سے لکھا ہے۔ میں وہ لکھ رہا ہوں جو مجھے یاد ہے۔ ایسی جذباتی باتیں ذرا بھولتی کم ہیں۔ اکثر حضرات عقیدت و محبت کے جوش میں بعض واقعات جو ان کو مدینہ میں پیش آئے ہیں انہیں

معجزات اور کرامات دیکھ لیتے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو دو واقعے اس قسم کے بیان کر سکتا ہوں، مگر نہ ایسے واقعات پر میرے مذہب کا دارومدار ہے نہ خود وہ واقعات ایسے ہیں کہ فلسفی اور علم نفسیات کا ماہر ان کے دوسرے معنی نہ بیان کر سکے۔ میں تو اس چیز کے مزے لے رہا ہوں جو باوجود میری سیاہ کاری کے اور بداعمالی کے مجھ کو نصیب ہوئی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

شیعوں کو جماعت کی نمازیں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ہر جگہ پر امام نہیں ہوتے۔ اور نصیب بھی ہو گئیں تو کمیاب ہونے کی وجہ سے ان کا اہتمام کچھ ایسا ہو جاتا ہے جیسے عید کی سویاں، وہ روز والی سادات جبکو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے وہ بات نہیں رہ جاتی۔ پیش نمازی کا مسئلہ شیعوں کے یہاں اتنی احتیاط کے ساتھ کہاں سے آ گیا۔ مجھ کو نہیں معلوم۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جس کو مجتہد اجازت دے وہی نماز پڑھا سکتا ہے۔ شرط شاید یہ ہے کہ جو گناہ کبیرہ نہ کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو وہ پڑھائے۔ یہ تو شیوہ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے اور ہم کو بھی یہی رائے رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ حضرات زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ لیکن مجتہد صاحب کو یہ اختیارات کہاں سے ملے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی ذیل میں تقلید کا مسئلہ بھی آ جاتا ہے۔

تقلید عالم کی کرنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی عالم کا مقلد نہیں ہے تو اس کی عبادت ہی بیکار ہے (واضح ہو کہ یہ گنہگار بہت دن ہوئے تقلید چھوڑ چکا ہے) ایسے وقت یہ آن پڑی ہے کہ خدا کی راہ ڈھونڈھنے سے بھی مشکل عالم کی تلاش ہو گئی۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس نے امام

ابو یوسف[1] کی وردی پہن لی وہ پیش نماز ہوگیا۔ ترقی کی تو مجتہد ہو گیا اور اگر ان کے یہاں عاقبتی جوڑے زیادہ آنے لگے تو اعلم کہلایا۔ کیونکہ علاوہ علمی استعداد کے مرجع خلائق ہونا بھی تقدس کی ایک نشانی ہے۔ اور ایک حد تک بجا بھی ہے۔ لیکن اعلم کا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو سکا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چند خاندان مخصوص ہو گئے ہیں جنہیں ہمیشہ مجتہد اور پیش نماز ہوتے چلے آتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تقلید کا مسئلہ پیری مریدی سے کم نہیں ہے۔ اکثروں کو یہ گنہگار جانتا ہے کہ وہ نمازیں پڑھاتے ہیں۔ مگر ویسے ہی دوسرے ہیں جن کے پاس اجازہ نہیں ہے اسی لیے وہ نہیں پڑھا سکتے۔ اعلم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جو اکثر پڑھے لکھے شیعوں کے دل میں کھٹکا کرتا ہے۔ مگر میں اس پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس کا بڑا افسوس ہے کہ شیعہ اکثر جماعت کی نماز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ "من المومنین خیر" پر عمل کر کے جس کا فسق مجبور نہ معلوم ہوا اور جو ضروری مسائل سے واقف ہو اسکے پیچھے نماز پڑھ لی جائے۔ اس جگہ ایک قصہ جملہ معترضہ کی طرح عرض کر دوں۔

مغرب کی نماز میں ایک سنی دوست کے ساتھ پڑھنے لگا۔ انھوں نے تلاوت شروع کی۔ ایاک نعبد وایاک نستعین .. .. ۔ ولدّ و آمین وغیرہ وغیرہ۔ ولاالضالین کی مد و سب غائب۔ میں نے نماز پھر سے پڑھ لی۔

اس بارے میں شیعوں کا مسئلہ جو مجھ کو بتایا گیا تھا۔ حسب ذیل ہے۔

نماز سنی امام کے پیچھے پڑھو۔ قرأت کی ضرورت نہیں ہے۔ رکوع و سجود اور تمام ارکان نماز ساتھ ادا کرو مگر نیت فرادیٰ کی کرو" میرا دل اس رویہ

---

[1] واضح ہو کہ سیاہ عمامہ اور قبا علماء کے لیے حضرت امام ابو یوسف ہی نے تجویز کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ

سے ہمیشہ کراہت کرتا رہا۔ اور جہاں تک یاد ہے میں نے حج کے پیچھے بھی ہمیشہ نیت جماعت ہی کی۔ اکثر شیعہ پڑھے لکھوں سے بحث بھی کی مگر کشتی ہمیشہ برابر پر چھوٹی۔ ممکن ہے وہ حضرات سمجھا کئے ہوں کہ میرا کندھا لگ گیا مگر میں اپنے چیت ہونے کا قائل نہ ہوا۔

مطاف میں پھر یہ مسئلہ میرے دماغ میں زور و شور سے آیا تھا میرے دل نے مجھ سے کہا: "اگر تمھاری فرادہ نیت کا حال دوسروں کو معلوم ہو جائے تو وہ تم کو گردن میں ہاتھ دیکر نکالدیں۔ جب تم سب ارکان تو ان کے ساتھ ادا کر رہے ہو تو یہ فرادہ کی نیت دھوکہ بازی کے سوا اور کیا ٹھہری۔ اور پھر اللہ میاں کے گھر میں یہ حرکت" میں کانپ گیا۔ اور وثوق سے امام کے پیچھے کی نیت کی۔ اور آج بھی کرتا ہوں۔ بیت اللہ میں اور نیز اس دربار میں بار بار خیال آتا تھا کہ ہر کام قاعدے کے موافق ہو جائے لہٰذا وہی خیال فرادہ نیت کا یہاں بھی دماغ میں آ گیا۔ میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" اور اپنی اسی روئیے پر قائم رہا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اگر وہاں جھوٹ خوف سے ترک ہوا تھا تو یہاں سچ ناز سے قائم رہا۔

ہم نے کہا ہم اصدق الصادقین کے امتی اور ہم دربار میں جھوٹ بولیں گے!

گوہرا دل کہ نزدم ز بیباکی نوشت — آن ہماں سنجد عیار گوہر یکتائے من
کز جہاں در خیر آیم زی زند گوش آیدش — مرحبا اے امتی از مرقد مولائے من
لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم — چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

جی تو چاہتا ہے ابھی اور لکھوں مگر ڈرتا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہ عرض کر سکوں گا جو ضروری ہو۔ اس لیے نگاہ خراشی سے کیا فائدہ۔ وہاں چلتے وقت استاد تو ضبط کرتا آیا ہوں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "[illegible]" یعنی جو تھار ن

زیارت کو آئے تم بھی اسکی زیارت کو جاؤ۔ یا رسول اللہ میں تو حاضر ہوچکا آپ ذری ہمارے مرتے دم خیال رکھے گا۔ اللھم صل علی محمد و آل محمد

جنت البقیع کی زیارت اکثر کی۔ قبور مطہرہ کی حالت دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ ممکن ہے اسکی وجہ سے میرے دل میں کچھ وہابیوں کے خلاف سختی پیدا ہو گئی ہو۔ شاید کوئی حدیث ہے جسمیں یمن کو روانہ کرتے وقت آنحضرت صلعم نے جناب امیر علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ کوئی اونچی قبر نہ دیکھنا مگر اس کو برابر کر دینا اور کوئی کتابہ دیکھنا مگر اس کو مار ڈالنا اور اسی طرح کی کوئی تیسری چیز کے لیے حکم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم فرزند اور جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا بضعۃ الرسول اور دوسرے اہلبیت علیہم السلام کے مزار مطہرات کھد گئے۔

قرآن میں تاویلیں ہوں۔ بہتر فرقے پیدا ہو جائیں۔ مگر اس حدیث کے سمجھنے میں ذری کی غلطی کیسے ہو سکتی تھی ؎

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

چوتھا باب

ناظرین آپ کو خیال ہو گا کہ مجلس کا ذکر کرتے کرتے میں نے حج کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب پھر وہی مجالس کے ذکر کی طرف عود کرتا ہوں۔ یہ الٹ پھیر تقریر میں جچ جائے مگر تحریر کے لیے زیادہ مناسب نہیں ہے مگر چونکہ میں نے وہی باتیں کرنے والا طرز تحریر میں بھی اختیار کیا ہے لہذا میری خاطر سے اس انداز کو برداشت کیجیے۔ اور ذہن میں وہی مجالس والا سلسلہ قائم رکھیے۔ یہاں تک تو اسباب کا تذکرہ تھا جن کی وجہ سے میرے خیالات بدلے آئندہ یہ ذکر ہے کہ کیونکر بدلے اور جب بدلے تو خیالات نے کیا صورت اختیار کی۔

شیعوں سے زیادہ کوئی فرقہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کے یہاں مجالس عزا کا سلسلہ تعلیم کا ایسا ذریعت جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی بد قسمتی ہے کہ ذاکرین کمزور روایتیں ضعیف روایتیں پڑھتے رہتے ہیں میرے بچپن میں تو یہ حال تھا کہ لوگ گڑھی روایتیں تک پڑھ جاتے تھے۔ خیر اب تو ایسا کم سنائی دیتا ہے۔ مگر پھر بھی بعض ذاکرین کا رجحان اس طرف دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر غلط روایتیں پڑھی جاتی تھیں تو اب منطق کا

پھیر پھیر صغریٰ اور کبریٰ کا جھمیلا عقل کو چکرا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر عرض ہے۔ آیت "بلغ ما انزل الیک" الخ کی تفسیر بیان کرتے وقت تمام ذاکرین بے دھڑک پڑھ جاتے ہیں کہ امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں آئی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس آیۃ کی دس شان نزول لکھی ہیں ان میں سے آخری یہ بھی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کسی ذاکر سے مندرجۂ بالا دعوے کے سوا کوئی تفصیل سنی نہیں۔

منطق کے مغالطوں کا کھیل ملاحظہ ہو کہ ذاکر صاحب اپنے زعم ناقص میں طے کیے ہوئے بیٹھے ہیں کہ کوئی ہم کو غلط ثابت نہیں کر سکتا مگر اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ بغیر یہ فرمائے کہ تفسیر کبیر میں دس شان نزول ہیں اور ان میں خود ان کی بیان کی ہوئی شان نزول صرف ایک ہے۔ سامعین کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں۔ ایک دوسری مثال دوسرے قسم کی ہے۔ اُحد کی لڑائی میں جن لوگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے ان میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جن ذاکر صاحب کو سنیئے پہاڑ پر جنگلی

---

[1] تفسیر در منثور سیوطی و کبیر

[2] ابن اثیر جزری۔ تاریخ کامل۔ بحوالہ تاریخ احمد صفحہ ۴۲-۴۳

[3] سورۂ آل عمران۔ ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلہم الشیطن ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللہ عنہم ان اللہ غفور حلیم ۵۵

دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے وقت جنھوں نے منہ پھیرا تھا ان کو ان کے گناہوں کی شامت سے شیطان نے بہکا دیا۔ اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔ بیشک اللہ بخشنے والا بردبار

بکری کے بھاگنے کا ذکر فرما رہے ہیں اور اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اُن کو خدائے تعالیٰ نے صریحی آیت بھیج کر معاف فرمایا ہے۔ منطق کے نزدیک بھی اس کا ذکر لاطائل ہے۔ مگر سب سے بڑی خرابی اس ذکر میں یہ ہے کہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کے احکام اور منشا کی وقعت اور اس سے محبت کم ہے۔ اور دوسروں کی برائی میں مزا زیادہ ہے۔ اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ باوجود معافی کی آیۃ کے بھاگنے والوں کی جگہ دل میں اُس قدر نہیں ہو سکتی جتنی نہ بھاگنے والوں کی ہوگی مگر زیادہ سے زیادہ آدمی اس پر عبرت کر لے۔ اعتراضات یا ہنسی اُڑانیکا موقع حکم خدا کے بعد نہیں رہ جاتا۔

محرم کی مجلسیں شیعوں کے ہاتھ میں ایسا آلۂ کار تھیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا ذکر نہیں۔ غیروں کا دل ہاتھ میں لے لیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی کہانی اتنی بڑی قربانی کا ذکر اس طرح فرمایا جا رہا ہے کہ بجائے اغیار کے دل میں جگہ ہونے کے شیعوں سے بیگانگی اور شکایت دلوں میں جگہ کر لی جاتی ہے۔

مردوں کے آنسو جو بہت بڑی چیز ہیں ریوڑی کے دو دو نہیں بلکہ دس دس بیس بیس ٹکے بک رہے ہیں۔ ایک بار میں علاج کی غرض سے لکھنؤ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چاندنی رات تھی۔ میں قریب ہی ایک دوست کے یہاں جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک مسجد پڑتی ہے۔ اسکے صحن کی دیوار اسقدر چھوٹی ہے کہ سڑک کی پٹری پر کھڑے ہو کر آدمی صحن کو بخوبی طرح دیکھ سکتا ہے۔ مسجد کے صحن میں منبر رکھا ہوا تھا اور مجلس ہو رہی تھی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میں خود مجلس کرنے والا اور رلوانا

مگر میرے اوپر ایک عجیب طرح کا اثر ہوا۔ اس اثر کو بیان کرنا مشکل ہے جیسے آپ کا خوب پیٹ بھرا ہو اور آپ کسی دوسرے کھانے والے کے قریب سے گزر لیے تو وہی خوشبو جو تھوڑی دیر پہلے بھلی لگتی تھی اُس وقت بُری لگے گی۔ وہی حال میرا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ پر درود کے نعرے بپا اور مسرت کا مظاہرہ ہو رہا اور دوسرے ہی لمحے پر نالے ہیں اور گریہ و بکا کا شور تھوڑی دیر میں یہ دھوپ چھاؤں کئی بار ہوئی۔ اس دلی تکلیف کو ظاہر کرنے کے لیے میرے دل میں الفاظ نہیں آ رہے تھے کہ اتنے میں پاس ہی کھڑے ہوئے دو پنجابی سنیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا "لکھنؤ کو انھیں باتوں نے تباہ کیا ہے۔

مظلومی کا لفظ جیسا اہلبیت نبیؐ پر عموماً اور کربلا والوں پر خصوصاً صادق آتا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ مگر اس لفظ کا استعمال کربلا کے واقعات پر اس قدر عام اور سستا کر دیا گیا ہے کہ جس کے بے موقع استعمال کی وجہ سے ہر شیعہ اور خصوصاً اودھ کا ہر چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر خود اپنے کو اس کا مصداق سمجھنے لگتا ہے۔ مختلف موقعوں پر شیعوں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر افسوس ہوا ہے کہ "ہم مظلوم کے ماننے والے ہیں اور خود مظلوم تو ہیں ہی" ذری غور کرنے کی بات ہے۔ کربلا کا ایسا ظلم کہاں ہوا ہوگا۔ مگر اس ایمانی ڈرامہ کے افراد میں اور ہیرو (روحی لہ الفداء) میں کچھ اور صفات بھی تھے تو مومنین کو چاہیے تھا کہ ذری وہ صفات بھی اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ خالی مظلوم جاننے سے تو دنیاوی اور عقباوی معاملات میں زیادہ فائدہ مترتب ہوتے دکھائی نہیں دیتا۔ اس جگہ ایک قصہ عرض کر دوں۔ میرے ایک دوست زیارت کربلائے معلیٰ کو مع عیال براہ زمین جا رہے تھے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ انھیں

سب ساتھی کراچی ہی میں رہ گئے۔ اور وہ تنہا چلے گئے۔ ان کو روانگی کا وقت نہیں معلوم تھا۔ وہ گئے تھے اپنی جگہوں کا معائنہ کرنے کہ جہاز چل پڑا ان کے پاس روپیہ تو تھا۔ مگر اور کوئی چیز نہ تھی۔ بچارے طہارت اور صوم صلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ اس نیک سفر کے جانے والوں کے دلوں میں بڑی نیکی ہوتی ہے۔ ہر شخص نے ہمدردی کی کسی نے جا نماز عاریتاً دی۔ کسی نے لوٹا دیا۔ کسی نے کمبل دیا۔ بہتوں نے تسکین دی۔ جن صاحب نے لوٹا یا کمبل دیا تھا اُن کے مُنھ سے نکل گیا "آپ محتاج ہیں آپکی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔" ہمارے دوست نے سب چیزیں اُٹھا کر پھینک دیں اور کہا کہ محتاج تو وہ ہیں جو تکلیف نہ اُٹھا سکے ہم تکلیف اُٹھائیں گے مگر یہ چیزیں اب بغیر دام دیئے نہ لیں گے۔ "تعز من تشاء بالقناعت وتذل من تشاء بالاحسان"

میری ناچیز رائے میں اس ادنیٰ ترین غلام سید الشہداء نے کچھ ایسا کام کیا کہ پتہ چلانے والے پتہ چلالیں کہ کس کا غلام تھا۔ بجائے اسکے صرف رونے میں تو تاسی کم دکھائی دیتی ہے۔ رونے کو مومنین مآل مجلس کہتے ہیں۔ میرے زعم ناقص میں رونا مآل ذاکر کہا جاتا تو بہتر تھا۔ میں رونے کا منکر نہیں ہوں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا کہ یہ موقع اتنے سستے نہ بیچے جاتے تو اچھا ہوتا۔ مشہور ہے کہ جنگ اُحد کے بعد گھروں سے رونے کی آوازیں آتی تھیں اور رسول صلعم نے فرمایا کہ ہمارے چچا پر رونے والا کوئی نہیں۔ اس کے بعد اصحاب نے اپنی عورتوں کو بھیج دیا۔ کہ وہ روئیں۔ یہ روایت؎ صحیح ہو یا غلط ہو۔ لیکن اگر صحیح بھی ہو تو دو باتوں کا

؎ ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے۔

پتا چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلعم میں انسانی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسی وقت ہوا تھا ہمیشہ کی رسم نہیں قائم ہو گئی تھی۔ بہرحال کربلا کے واقعات پر جس کا دل نہ اُبھرے وہ اپنے دل میں پتھر رکھتا ہوگا۔

رونے سے دل کی سلیٹ صاف ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد جو نقش بیٹھے گا وہ روشن ہوگا۔ گریہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ماتمی اصل چیز سمجھی جائے اور مآلِ مجلس صرف رونا ہی نہ سمجھا جائے ؎

غم سے عبرت کا ذوق حاصل ہے　　غم نہایت مجلّیِ دل ہے
غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے　　نہ کہ جو رسم کا چراغ بنے

یہ دو شعر اکبر الہ آبادی مرحوم کے ہیں جو تصوف کی بڑی بلندی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ایک شعر نجم صاحب اکبر آبادی کا بھی عرض کر دوں ؎

شربت کی طرح پیتا ہوں آبِ دمِ شمشیر　　دنیا میری محنت کو تماشا نہ بنا دے

یہی تصنع کی ذہنیت مجھے بدقسمتی سے عزاداری کی ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے۔ برسہا برس غور کیا کہ کیا کروں۔ یہ طاقت اپنے میں پاتی نہیں کہ اصلاحیں کروں۔ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ نہ اتنا بڑا مقرر نہ اتنا بڑا منشی کہ کتابیں لکھوں۔ زبان یا قلم سے کچھ کہا بھی تو کسی نے اعتنا نہ کی اور جا اعتنا نہ کی۔ بادشاہ کا نقارہ چوہے کی کھال سے کہاں منڈھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی خیال آیا کہ ہر چیز اپنے پہلے مقصد سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ جب تک پوری عمارت ڈھا کر پھر سے نہ بنے کوشش سود مند ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک چھوٹا آدمی یہ کام کیسے کر سکتا ہے۔ دل نے کہا تم اپنا کام کر جاؤ اسکی فکر مت کرو کہ دوسرے کیا کرتے ہیں۔ ؎

"دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لنبا قصہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے"

اس کے بعد جس چیز کو میں کرنا چاہتا تھا کر گذرا۔ یعنی۔ محرم مجلس جلوس۔ تعزیہ۔ مہندی اور محرم کے تمام مناسک چھوڑ دیئے۔ اسی کے ساتھ محفل میلاد۔ مردہ اعزا کا فاتحہ۔ خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر مزدوری دیکر قرآن خوانی سب ترک کردی۔ ان تمام چیزوں میں بعض ایسی بھی تھیں کہ انھیں دوسروں کے ناز بھی اٹھانا پڑتے تھے۔ یہ بھی تکلیف دل کو رہتی تھی۔ اب چھوڑنے کے بعد اس سے بھی چھٹی ملی۔

کتنا حصہ میرے اس فعل میں ناز برداری کے ڈر سے نفس کا تھا اور کتنا واقعی نتیجہ خیالی کا۔ یہ دوسرے طے کریں۔ میں نے اپنے دل کو بہت تولا۔ ناز برداری والا جزو گو موجود پایا مگر کم پایا۔ اور عقیدہ والا جزو بہت پایا اصل حقیقت خدا کو معلوم ہے۔ میں نے اپنے دل سے کہا "محمد علی تمھاری نیت نیک ہے اگر تم غلطی پر بھی ہو تو تمھاری نیت کی وجہ سے خدا تم کو انشاءاللہ معاف کردیگا"

تم اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ لوگ امام حسین علیہ السلام کی محنت اور قربانی کو روزی کا ٹھیکرا بنا رہے ہیں یا علاوہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے کسی دوسری غرض سے بھی کررہے ہیں۔ اس لیے تم اس کو ترک کررہے ہو لہذا تم سے نہ رسالتمآب ناراض ہوں گے نہ ان کے اہلبیت علیہم السلام۔ تمھارے اس فعل کو تمھارے ہی ہم چشم برا کہیں گے لیکن شائد ہزاروں ہزاروں میں ایک آدمی ایسا بھی نکل آئے جو بجائے یکبارگی غصہ کرنے کے یہ بھی سوچے کہ باوجود ادعائے محبت کے پھر بھی یہ کام اس کمبخت نے کیوں کیا۔ اور اس طرح سے شاید وہ بھی تمھارا ہم خیال ہوجائے یا کم سے کم اس پہلو سے غور تو کرے"

یہ میرا معاملہ ہے جو میرا پیدا کرنے والا بہتر جانتا ہے۔ پھر بھی یہ کھٹک باقی رہ جاتی ہے کہ تم بذات خود امام حسین علیہ السلام کے احسان کا کیا بدلہ کر رہے ہو۔ میرا جواب یہ ہے کہ جو دوسرے کر رہے ہیں وہ احسان کا شکر نہیں ہے اور میں سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ برادران ملت کو اس غلطی سے آگاہ کر دوں" یہ میری بدقسمتی ہے۔ شومیٔ قسمت ہے کہ مجھ سے اظہار شکر میں اور کچھ نہیں ہو سکتا خدا کا حکم۔ رسول کا حکم مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام کے احسانات پر اظہار شکر بھی ہے جو مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

خدا مجھ کو معاف کرے اور توفیق دے کہ کچھ مجھ سے نیکی ہو جائے مگر جس چیز کو میں غلط جانتا ہوں اس کو اس دلیل سے اختیار نہیں کر سکتا کہ چونکہ صحیح بات مجھ کو نہیں معلوم ہے اس لیے میں غلط ہی کیا کرونگا۔ میرا خدا میری نیت سے واقف ہے۔ میری بداعمالیوں سے نواہی اور اوامر کی عدول حکمیوں سے واقف ہے وہ چاہے گا مجھ پر رحم کرے گا۔ نہیں تو اس گنہگار کو کیفر دار کو پہونچائیگا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میرے اس اقدام سے لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اس نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ ایک دوست نے پوچھ بھی لیا کہ تم سُنی ہو گئے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ "اگر مجھے سُنی ہی ہونا ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا"۔ اکثر حضرات نے میرا مذہب دریافت کیا۔ اور جب میں نے کہا کہ اپنے کو مسلمان کہتا ہوں اور خدا مجھے مسلمانوں میں شمار کرے تو سننے والوں کو تسکین نہ ہوئی۔ حیرت کا مقام ہے۔ خدا کا بھیجا ہوا نام۔ رسول کا لایا ہوا نام "مسلمان" مجہول المعنی ہو گیا۔ جب تک شیعہ۔ سُنی۔ وہابی کی ٹھیک نہ لگاؤ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کہنے والا مذہباً کیا ہے۔ ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے　　امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ افتراق بیجا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام پر پڑا۔ اس سے بڑی بدقسمتی مسلمانوں کی اور کوئی نہیں۔

اس گنہگار کے مذہبی خیالات حسب ذیل ہیں۔ کل کیا خیالات ہوں گے۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

پانچواں باب

“خدا کے وجود کا قائل وجدانی دلائل سے ہوں جن میں معرفت ربی بفحوائے لعن اللہ” سب سے روشن دلیل ہے۔ رسالت کا قائل ہوں کہ جناب رسالت مآب خاتم النبیین تھے اور بذریعہ وحی تبلیغ فرماتے تھے۔ اور جہاں تک خدا کے احکام پہونچانے کا تعلق ہے معصوم تھے۔ اسکے علاوہ ویسی عصمت کا قائل نہیں ہوں کہ کوئی بشر ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ گناہ کر ہی نہ سکتا ہو۔ قرآن شریف میں کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی غلطی سے بری نہیں۔ سورۂ توبہ کے رکوع سات میں ہے: “اے محمدؐ اللہ تجھے معاف کرے سچوں کی حالت ظاہر ہوئے بغیر اور جھوٹوں کو سمجھے بغیر تو نے ان کو لڑائی میں نہ جانے کی اجازت کیوں دی۔” سورۂ مومنون کے رکوع چھ میں ہے: “اے محمد تو کہہ۔ میرے رب! ۔ میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ ڈھونڈھتا ہوں۔ اور میرے رب! اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔”

سورۂ انعام کے رکوع آٹھ میں ہے: “اے محمد جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں سے تمسخر کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر جا۔ یہانتک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان یہ ممانعت تجھے بھلادے تو یاد آنے کے بعد ان بے انصافوں کے ساتھ نہ بیٹھنا۔”

سورہ عبس کے شروع میں ہے "ایک اندھے کے آنے سے محمد ترشرو ہوا اور منہ پھیر لیا۔ اے محمد تو کیا جانے۔ شاید وہ تیری تعلیم سے پاک ہو جاتا"

میں اس مقام پر اس آیت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا ہوں جہاں سورہ النجم میں لات وعزیٰ اور منات کا ذکر ہے۔ جسکی تفسیر میں بڑے بڑے مفسرین ہفوات بک گئے ہیں اور جس کا ہونا اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ سورۂ حج کے رکوع سات میں یہ آیت آئی ہے۔ "اے محمد تجھ سے پہلے جو رسول اور نبی ہم نے بھیجے تھے انھیں بھی یہ معاملات پیش آئے کہ ان کی تمنا میں شیطان نے وسوسے ڈالے۔ لیکن اللہ نے شیطانی وسوسے مٹا دیئے اور اپنی آیتیں مضبوط کیں۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ ان معاملات میں اللہ کو یہ منظور رہا کہ وسوسۂ شیطانی سے مریض القلوب اور سخت دلوں کو آزمائے، بیشک یہ ظالم کفار مخالفت بعید میں ہیں"۔ جب دو دو سو برس کے بعد پیغمبر اور صحابہ کے اقوال خالی حافظہ کے بھروسہ پر لکھے جائیں گے۔ جب ان کی صحت پر تلواریں کھینچ جایا کریں گی تب تو پیغمبر صاحب پر تہمتیں لگیں ہی گی۔ ذاتی فہم یہ کہ جو آیتیں میں نے رسول اللہ صلعم کی بشریت کے بارے میں عرض کی ہیں اور وہ آخری آیت جسکی تفسیر میں یہ ہے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلعم[1] نے لات وعزیٰ اور منات کی تعریفیں کی ہیں کہ ان سے معاذ اللہ شفاعت کی امید ہے: زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ رسول اللہ پر تہمت ہے اور ایمان

---

[1] ملاحظہ ہو "جارج سیل" اور دوسرے عیسائیوں کا ترجمہ قرآن جہاں سورۂ النجم میں لات وعزیٰ کا ذکر ہے۔ اور سورۂ حج رکوع سات۔ ویری زیرِ ۔ اس قصہ کے متعلق بیضاوی۔ جلال الدین و یحییٰ وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ امیر علی نے اسپرٹ آف اسلام اور اپنی تاریخ میں اسپر بحث کی ہے۔ ۱۲

تو یہ معنی آئینہ کرتا ہے کہ

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل   سلمیٰ حدث تو لیلیٰ قدم را

یا تو ان تغیر کرنے والوں کو لغو اور بیہودہ کہیے یا "ما ینطق عن الھوا" کو قرآن سے نکال ڈالیے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلعم نعوذ باللہ من ذالک احکام خدا کے خلاف کوئی بات کرتے تھے۔ یا ائمہ اثنا عشر کوئی بات خلاف حکم خدا و رسول کرتے تھے یا توبہ توبہ گناہ کے مرتکب ہوتے تھے

جب آج بہت سے آدمی موجود ہیں جن کے لیے تعزیرات ہند بیکار سی چیز ہے تو ان پاک ہستیوں کے اوپر کوئی ایسا گمان کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن شریف میں آیتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بشر سے غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ جب جناب رسالتمآب صلعم کے لیے یہ کہا جا سکے تو تیرہ باقی ائمہ علیہم السلام کے لیے بھی یہی رائے ہو گی۔ گو نسل کہیے۔ تربیت کہیے یا خدا کی خاص عنایات کہیے ان بزرگواروں کا برا کہنے والا بہتر فرقوں میں سے کسی کو نہیں سنا۔ خوارج سے میں واقف نہیں ہوں نہ ان کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ لیکن جہاں تک سنا ہے وہ لوگ بھی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی نسبت صرف یہی کہتے ہیں کہ ان حضرات کے وقت میں خانہ جنگیاں ہوئیں۔ اس لیے یہ حضرات رسول پاک صلعم کے نعوذ باللہ خلیفۂ برحق نہیں تھے۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام میں ایک بات جداگانہ ہے۔ اکثر حضرات ائمہ کے دنیاوی آرام سے کم و بیش محروم رہے۔ مگر ان میں کا ہر فرد صلوٰۃ اللہ علیہم وعلیٰ جدہ و ابیہ جس حال میں رہا ہمیشہ معلم دین حق رہا۔ ہادی راہ خدا ہی رہا۔ اور ان کی وقعت اپنے پرایوں کے دلوں پر سکہ جمائے رہی چاہے تخت خلافت پر ہوں۔ چاہے کربلا کے میدان میں تڑپ رہے ہوں

چاہے قید میں ہوں چاہے خانہ نشین ہوں۔ چاہے حجر اسود کا بوسہ دینے جا رہے ہوں۔ ولی عہدی ہو کہ وزارت ہو۔ نظر بندی ہو کہ آزادی ہو یہاں تک کہ سن بست کو بھی نہ پہنچے ہوں ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا تھا "یہ تو عوام کے گروہ کا فرد نہیں" اللھم صل علی محمد و آل محمد و بارک وسلم۔ کما صلیت و بارکت وسلمت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم۔ انک حمید مجید برحمتک یا ارحم الراحمین؛

ایشیا کی تاریخ سے لوگ واقف ہیں۔ دنیا کی تاریخ جانتے ہیں۔ کوئی مثال نہیں ملتی کہ تیرہ پشتوں تک کسی خاندان کے ایسے افراد ہوئے ہوں کہ باوجود زمانہ کی ناسازگاری کے اور باوجود مخالفت کے ان کا وقار یگانے بیگانے اپنے پرائے سب کے دلوں میں رہا ہو۔ گو میں چاہتا تھا کہ دوسروں کے اقوال کم لکھوں۔ مگر اس جگہ مجبور ہو گیا ہوں۔ مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کی کتاب "مذہب و باطنی تعلیم" سے کچھ نقل کرنا چاہتا ہوں۔ نقل کرنے کے پہلے اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ کتاب ایک پڑھے لکھے آدمی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ دو حضرات کی رائے جو اس کتاب کے متعلق ہے لکھے دیتا ہوں، وھو ھذا۔

ایک شیعہ فاضل کا قول ہے :۔ "اس نے تو مذہب شیعہ کی جڑ ہی کاٹ دی۔"

ایک سنی فاضل کا قول ہے "کتاب تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے اور مصنف نے منصفانہ نظریہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر بعض جگہ کھل گیا ہے کہ مصنف شیعہ ہے۔" اگر اور نہیں تو یہی دو رائیں اس کتاب کی راست بازی کی اچھی دلیل ہیں۔

"سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذات بابرکات اسلامی تاریخ میں

ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور سیدنا علیؑ اور سیدنا حسین علیہم السلام کے بعد شیعہ تخیلات میں ان کا تصرف سائر ائمہ سے زیادہ نظر آتا ہے۔ امامیہ اثنا عشری ان کو اپنے مذہب کا مدون خیال کرتے ہیں۔ صوفی ان کو مشائخین طریقت میں اعلیٰ رتبہ دیتے ہیں۔ ان کے تلامذہ کی فہرست میں اہلسنت کے فقہ کے امام ابو حنیفہ اور مالک بن انس۔ معتزلہ کے پیشوا۔ واصل ابن عطا تصوف اور کیمیا کے شہرۂ آفاق عالم جابر ابن حیان جیسے اشخاص کو شمار کیا جا ہے۔ اگرچہ واقعات کے اعتبار سے ان میں سے بعض اشخاص کی نسبت تلمذ صحیح یا غلط ہو۔ لیکن ایسے روایات اس امر کے شاہد ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کا اپنے معاصرین کے خیالات پر بہت قوی اثر ہوا ہے۔ شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنے "تذکرۃ الاولیا" کو تبرکاً ان کے ذکر سے آغاز کیا ہے اور ان کے کمالات باطنی کے بہت سے شواہد نقل کیے ہیں۔ شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل و النحل" میں ان کے علمی اکتسابات اور زہد و تقویٰ کا بہت زور و شور سے اور شد و مد سے اقرار کیا ہے۔ غرضکہ مسلمانوں کے تقریباً سب فرقوں کا اس قول پر اتفاق ہے کہ علاوہ نسبی فضیلت کے وہ ایک زبردست شخصیت کے حامل تھے۔ اکثر مقتدایان مذاہب مرنے کے بعد مبالغہ آمیز روایات اور غالی معتقدات کا محور و مرکز بن جاتے ہیں۔ لیکن خطابیہ کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ سیدنا جعفر صادقؑ علیہ السلام اپنی حیات ہی میں الوہیت سے متجلی کر دیئے گئے تھے۔ بہت سے معرکۃ الآرا مسائل مثلاً نور رسالت کا مسئلہ ان کی شہادت پر نقل کیے جاتے ہیں شیعہ امامیہ اپنے شرعی معاملات میں ان سے استناد کرتے ہیں اور باطنیہ اپنے عجائبات کو ان سے منسوب کرتے ہیں۔ جابر ابن حیان۔ حضرت ذوالنون مصری اور بہت سے صوفی بزرگ ان کو اسرار خفی و جلی کا معلم قرار دیتے ہیں۔ منجملہ اور علوم

غریبہ کے قرآن مجید کی باطنی تاویل جس کا اسمٰعیلی اور صوفی روایات میں ذکر آتا ہے حروف و اعداد سے مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا وہ طریقہ جسکو عرف عام میں علم جفر کہتے ہیں دونوں کا ماخذ سیدنا جعفر صادقؑ کی تعلیم کو تصور کیا جاتا ہے۔

میرے یہ خیالات تو ائمہ معصومین علیہم السلام کے لیئے ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں برخلاف شیعوں کے سب کو صاحبان ایمان اور فدائے رسول صلعم اور نیک نیت جانتا ہوں۔ جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی گود کے پلے تھے اور شاگرد سعید تھے جن کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی ایسی باتیں کہیں ہیں کہ کسی کیلئے نہیں فرمائیں۔ انھیں سب سے افضل جانتا ہوں مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صفات و فضائل کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو محبت کا درجہ حضرت ابوبکر کو رسول اللہ سے حاصل تھا اور جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفۂ اول کو ذات پاک محمدی سے تھی اس کی مثال ذرا ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے تھے "کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں" رسول کے گود کے پالے حضرت علی کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انھوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ "رسول اللہ" کا لفظ مٹانا۔ میں سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یار عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کیے "میاں جو کچھ کہتے ہو وہی سچ ہے" یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے۔ بلکہ خود میرے دل کا گڑھا ہوا ہے مگر مجھ کو اس میں کچھ ایسی وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ احد میں جب رسول کی غلط شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو حضرت عمرؓ کے منھ سے بہ تقاضائے محبت نکل گیا اب

---

[1] تاریخ الخمیس حسین دیاربکری بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۹۵ ۱۲

کیا کریں گے (ذکر)" حضرت ابوبکرؓ نے کہا "اب کیا کریں گے جی کر" جو شخص حضرت علیؑ سے یہ کہدے کہ اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ یا علی آپ کو اختلاف ہوگا تو میں خلافت قبول ہی نہ کرتا، جو شخص یہ کہے کہ جب تک سیدہ اس گھر میں موجود ہیں مجھ سے نہ ہوگا کہ علی سے زبردستی کرکے بیعت لوں، اس کی نیت پر کون حملہ کرسکتا ہے"

ایک بڑے سنی عالم متبحر کی بیٹی جو خود بھی پڑھی لکھی اور آزاد خیال خاتون ہیں اور تشیع کا ادعا نہیں کرتی ہیں حضرت ابوبکر کے قول پر کہنے لگیں اگر ان کا واقعی خیال یہی تھا تو خلافت چھوڑ کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا کہ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ ہر معاملہ میں وہ یہی خیال کرتا ہے کہ جو کام درپیش ہے اس کو میں دوسرے سے اچھا کرلیتا اگر حضرت ابوبکرؓ کے دل میں بھی یہی خیال رہا تو کیا تعجب ہے۔ علاوہ اس کے خلافت قبول کرنے کے بعد اور بیعت لینے کے بعد انتظام کو پھر سے بے انتظام کرنا حکمت عملی۔ معاہدہ ہر چیز کے خلاف ہوتا" میرے جواب سے وہ خاتون چپ ہوگئیں۔ اس جگہ دل چاہتا ہے کہ وہ گفتگو بھی نقل کردوں جو میرے اور میرے مرشد مولانا کرامت حسین صاحب علی اللہ مقامہ کے درمیان میں آئی۔ میں نے سوال کیا کہ خلافت کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔ فرمانے لگے "میرے خیال میں رسول اللہ صلعم کا دلی منشاء تو یہی تھا کہ میرے بعد علیؓ خلیفہ ہوں مگر چونکہ کوئی صریحی حکم خداوندی اس بارے میں نہیں

۱؎ تاریخ اسلام کامل جلد اول صفحہ ۹۰ مصنفہ عبدالقیوم ندوی ۹۰

۲؎ روضۃ الاحباب۔ بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۳

۳؎ تاریخ اسنی المطالب شمس الدین جزری ابن قتیبہ۔ ماخوذ تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۶

آیا تھا اس لیے اُنھوں نے کچھ نہیں کیا۔ اسکے بعد اپنی طرف سے کہنے لگے۔ میرے خیال میں تو اچھا ہی ہوا کیونکہ حضرت علی سے وہ سب کچھ نہ ہو سکتا جو ہوا۔" میرے خیال میں جب اُنھوں نے یہ کہا تھا تو وہ فتح ایران اور فتح مصر وغیرہ کا خیال کر رہے تھے۔ تاریخ اسلام اور فلسفہ مغربی کے عالم متبحر تھے۔ یہی باتیں مختلف پیرایوں مختلف مباحث کے سلسلے میں ان سے میں اکثر سن چکا تھا۔ اس لیے میرا کامل یقین ہے کہ جب انھوں نے یہ کہا تھا تو دوسری تیسری اور چوتھی خلافتیں اُن کے ذہن میں تھیں۔ میری ناچیز رائے میں خود جناب امیر علیہ السلام نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ رسول اللہ صلعم ان کو اپنا خلیفہ بنا چکے ہیں۔

حضرت عثمان کے خلیفہ منتخب ہوتے وقت انھوں نے جو دلائل اپنے لیے پیش فرمائے تھے اسکے اوپر حضرات شیعہ بھی اس تیرہ سو برس سے اوپر میں کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ مگر انمیں بھی کہیں یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ نے ان کو اپنی حیات ہی میں خلیفہ بنا دیا تھا جو دلائل حضرت علی نے اپنے استحقاق انتخاب پر دیئے تھے حسب ذیل ہیں۔

(۱) سابق الایمان
(۲) یا علی انت بمنزلۃ ہارون من موسیٰ۔
(۳) مدینۃ العلم
(۴) قرابت قریبہ
(۵) سورۃ برأت لیکر جانا۔
(۶) ہر موقع پر رفاقت
(۷) مواخات

(۸) کسی کو میرے اوپر کبھی امیر بنا کر لڑائی میں نہیں بھیجا

(۹) من کنت مولا فہذا علی مولا۔

(۱۰) دعوت عشیرہ۔

(۱۱) ان سب سے بڑھ کر آیت مباہلہ ہے جہاں "انفسنا انفسکم" آیا ہے۔ ان سب دلائل میں کہیں بھی نہیں ہے کہ آنحضرتؐ اپنی زندگی ہی میں جناب امیر کو خلافت عطا کر چکے تھے۔ دعوت عشیرہ سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے۔ لیکن بائیس تئیس سال میں پھر اس واقعہ کی تصدیق نہیں منوائی گئی۔ اور باوجود دعوت عشیرہ والی روایت کے بھی جناب امیر علیہ السلام نے کبھی نہیں فرمایا کہ ہم کو آنحضرتؐ خلیفہ بنا چکے ہیں۔ رہا اخلاقی ثبوت وہ تو ہر جگہ شروع ہی سے موجود ہے۔ سوائے اسکے کہ رسالتمآب نے امت کا حق انتخاب باقی رکھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے صفات میرے دماغ میں حسب ذیل ہیں۔ ایمان کی مضبوطی۔ ارادہ کا استقلال۔ خود اپنے نفس سے بے پروائی۔ دولت سے استغنٰی۔ مساوات کے اصول پر اٹل رہنا اسلام سے محبت۔ جس دن حضرت عمرؓ اسلام لائے اس دن سے کھلم کھلا مکہ میں اسلام برتا جانے لگا۔ تبلیغ خدمات اسلام کے فتوحات وغیرہ کے پہلو سے حضرت عمر کے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یروشلم کی فتح کے بعد فاتح کا شہر کے اندر اس طرح سے داخل ہونا کہ غلام سوار ہو اور خلیفہ پیدل یہ مساوات کی بہترین مثال ہے۔ لیکن حضرات! وہ یار عتیق والی بات نہیں تھی۔ گو

---

[1] فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین آیت ۶۱ (سورۂ آل عمران)

حضرت ابو بکرؓ بھی زیادہ سن میں مسلمان ہوئے۔ مگر ان کی خصوصیتوں کا کیا کہنا۔

حضرت عمرؓ کے دل پر عرب کی قدیم ملی حکومت کا بہت گہرا اثر تھا۔ اور جسکی تطبیق وہ اسلامی اصول سے ہمیشہ کیا کئے۔ عرب میں قحطان، عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے وقت سے جمہوری طرز حکومت چلا آتا تھا۔ یہ لوگ اس پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے اشعار ہمارے قوانین ہیں یعنی جو شعر جمہور کو پسند آگیا وہی ہمارا قانون ہوگیا۔ اور ہماری پگڑیاں ہمارے تاج ہیں۔ یعنی ہمارے ملک میں بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کرنا ایسا کہ اسی ملک میں ایسا انسان فوق الانسان پیدا کردیا گیا جس نے نہ صرف جسموں پر بلکہ دلوں پر بھی حکومت کی۔ اور اسکے سامنے سبھی نے خوشی سے سر جھکائے مگر جن لوگوں کو قرب رسالت نصیب ہوا تھا اُن میں بھی گو نور ایمان کی روشنی جاہلیت کے اندھیرے کو دبا رکھے ہوئے تھی مگر شعور باطنی تو اسلامی مساوات کی تطبیق قدیم مساوات سے کیا ہی کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی خاندان کی دوامی حکومت عرب کو فطرتاً ناگوار تھی۔ باغ فدک جو حضرت ابو بکر صدیقؓ جناب سیدہ صلوات اللہ علیہا کو دے رہے تھے مگر حضرت عمرؓ نے روک دیا۔

خود اپنے بیٹے کو باوجود اہل ہونے کے خلیفہ نہ مقرر کرنا۔ اپنے ایک دوسرے بیٹے پر حد جاری کرنا۔ یہ سب اسی ملی حکومت کے ذیل میں آتا ہے۔ حضرت علیؑ سے بیعت لینے پر اصرار اور حضرت ابو بکرؓ کا رکنا۔ یہ سب میرے خیال کی تائید کرتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ انسان ہی تھے۔ معصوم تو تھے نہیں۔ پھر باوجود اچھے آدمی ہونے کے طبائع

لہ تاریخ احمدی صفحہ ۱۰۸ بربان روح تعلیم سید شبلی بحوالہ کلام سید ابن جوزی سے نقل کیا ہے۔

کا اختلاف اپنا اثر دکھاتا ہی رہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جو کیا وہ انھیں کی اُفتادِ طبیعت کا نتیجہ تھا۔ امام حسن علیہ السلام نے جو کیا وہ وہی کر سکتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے جو کربلا میں کر دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ اسی طرح حضرت عمر کو بھی سمجھ لیجیے کہ اُن کے دل میں بھی ملک کی محبت۔ رسول کی محبت اسلام کی محبت ہر چیز اسی طرح بروئے کار آئی۔ جیسی افتادِ طبیعت تھی۔ ان سب چیزوں پر غور کرنے کے بعد" میں" (جسکی تربیت شیعہ ہوئی ہے") اس نتیجہ پر پہونچنے پر مجبور ہوں کہ اہلبیت سے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک طرح کی کدسی ہو گئی تھی۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ مجھ کو اپنی طبیعت کے خلاف ایسی بات لکھنی پڑی جو زیادہ مسلمانوں کو بُری لگے گی۔ مگر میں بھی اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں۔ جو مکالمہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عمرؓ کے درمیان میں آیا وہ میرے خیال کی صرف تائید ہی نہیں کرتا بلکہ نقش اور گہرا کر دیتا ہے یہ واقعہ طبری میں ہے اور تاریخ کامل ابن اثیر جزری میں ہے۔ میں مولانا شبلی کی الفاروق سے ایک جزو نقل کر رہا ہوں مفصل روایت طبری میں پڑھ لیجیے۔ مفصل نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بحث کچھ خوشگوار نہیں بعض سخت جملے ہیں جو مولانا شبلی چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر کا کراہت کا لفظ استعمال کرنا۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس کا "ذالک بانھم کرھوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالھم" پڑھنا اور حضرت عمرؓ کا "حسد" کا لفظ بنی ہاشم کے لیے استعمال کرنے پر حضرت عبداللہ ابن عباس کا آیۂ تطہیر پڑھنا اگر پوری روایت تاریخ طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر جزری میں پڑھیے تو میرے خیال کا پتہ چلتا ہے۔ اور نیز یہ بھی کہ سادات کا جو جذبہ حضرت عمر

؎ مورخ ابن قتیبہ۔ ملاحظہ ہو تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۰

میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اب مکالمہ ملاحظہ ہو۔

حضرت عمر۔ کیوں عبداللہ ابن عباس علی تمہارے ساتھ کیوں نہیں شریک ہوئے۔؟

عبداللہ ابن عباس۔ میں نہیں جانتا۔

حضرت عمر۔ تمہارے باپ رسول اللہ کے چچا اور تم رسول اللہ کے چچیرے بھائی ہو۔ پھر تمہاری قوم تمہاری طرفداری کیوں نہیں کرتی۔

حضرت عبداللہ ابن عباس۔ میں نہیں جانتا۔

حضرت عمرؓ :۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ تمہاری قوم تمہارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی۔

عبداللہ ابن عباس :۔ کیوں ؟

حضرت عمرؓ :۔ وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ہی خاندان میں نبوت اور خلافت دونوں آجائیں۔ شاید تم یہ کہوگے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تم کو خلافت سے محروم کر دیا۔ لیکن خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ ابوبکر نے وہ کیا جس سے زیادہ مناسب کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو ان کا ایسا کرنا تمہارے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوتا۔

دوسرا مکالمہ ؎

حضرت عمرؓ :۔ کیوں عبداللہ ابن عباس تمہاری نسبت میں بعض بعض باتیں سنا کرتا تھا لیکن میں نے اس خیال سے اسکی تحقیق نہیں کی کہ تمہاری عزت میری نظر میں کم نہ ہو جائے۔

عبداللہ ابن عباس :۔ وہ کیا باتیں ہیں ؟

حضرت عمرؓ :۔ میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ لوگوں نے ہمارے خاندان

؎ ملاحظہ ہو الفاروق حصہ اول صفحہ ۲۰۲۔۲۰۵ مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۸۹۹ء بار دوم

سے خلافت حسداً اور ظلماً چھین لی۔

عبداللہ ابن عباس :۔ ظلماً کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ بات کسی پر مخفی نہیں۔ لیکن حسداً۔ تو اس کا تعجب کیا ہے۔ ابلیس نے آدم پر حسد کیا اور ہم لوگ آدم ہی کی اولاد ہیں۔ پھر محسود ہوں تو کیا تعجب ہے۔

حضرت عمرؓ :۔ افسوس خاندان بنی ہاشم کے دلوں سے پرانے بغض اور کینے نہ جائیں گے۔

عبداللہ ابن عباس :۔ ایسی بات نہ کہیئے۔ رسول اللہ صلعم بھی ہاشمی ہی تھے۔

حضرت عمرؓ :۔ اس تذکرہ کو جانے دو۔

عبداللہ ابن عباس :۔ بہت مناسب۔

گو بہت سی باتوں میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اہلبیت کا حفظ مراتب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی میرا خیال جو عرض کیا گیا ہے وہ باقی ہی ہے۔ میرے خیالات مختلف کتب پڑھ کر پیدا ہوے۔ جیسے تاریخ طبری۔ تاریخ کامل اور ابوالفدا وغیرہ کے حوالجات ہیں۔ مگر میں اس سے زیادہ ان کے دلائل لکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے عقائد اس طرح کے ہیں۔ ہر شخص اپنی قبر میں جانے والا ہے اور ہر شخص رحم وعفو کا خواستگار اور محتاج ہے۔ خدا ہر شخص کو ہدایت دے اور مجھ کو بھی ہدایت دے آمین

چھٹا باب

اپنے خیالات کی تائید میں ایک بات اور عرض کر دوں جسکے بعد آگے چلوں۔ وہ ابن عباس والی روایت جو ہر جگہ موجود ہے یعنے “حدیث قرطاس” وہ دل میں ایسی کھٹکتی ہے کہ میرے مخالف خیالات موافق نہیں ہونے پاتے۔ مولانا شبلی مرحوم نے زیادہ تر اس واقعہ کی تردید کرنی چاہی ہے۔ مگر تیرہ سو برس کے بعد عقلاً تردید کرنا جبکہ فرق اسلام کا مدار نقل کے اوپر ہو کچھ لگتی ہوئی بات نہیں۔ طبرانی میں یہ روایت حضرت عمرؓ سے مسلم میں، بخاری میں۔ مسند احمد بن حنبل میں۔ شرح شفائی قاضی عیاض میں جسکو شہاب الدین خفاجی نے لکھا ہے۔ علامہ شہرستانی کی ملل النحل میں جیسی تحقیقات سے ان حضرات نے لکھا ہے وہ شاید علامہ شبلی کی تحقیقات سے کم نہ رہی ہوں گی۔ زمانہ کی قربت کی وجہ سے ان لوگوں کو شاید کچھ آسانیاں بھی شبلی مرحوم سے زیادہ رہی ہونگی۔ خود مولانا شبلی نے اس روایت پر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی عمر اسوقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اس جگہ موجود نہ تھے۔ ‘اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ اُنھوں نے کس سے سنا تھا۔’ پھر حاشیہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ ”بخاری میں جو حدیث مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اس واقعہ میں موجود تھے۔ اس لئے محدثین نے اس پر بحث کی

ہے اور یہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے درایت سے کام نہیں لیا، خود درایت سے کام لیجیے اور کہتے ہیں یہ گو صرف صحیح بخاری میں سات طریقوں سے مذکور ہے لیکن بجز عبداللہ ابن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں ہے۔” میں عرض کرتا ہوں کہ یہی غنیمت ہے کہ عبداللہ ابن عباس ہی سے منقول ہے۔

رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی جس پارٹی کی حکومت جن کا اثر اور جن حضرات کا اختیار رہا ان میں سے اگر کسی اور صحابی نے نہیں لکھا تو کیا تعجب ہے۔ آیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ کسی صحابی نے اتنے بڑے اہم واقعہ کی۔ اتنی بڑی تہمت کی تردید بھی کی ہے۔ کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے غلط کہا ہے۔ میں اصول روایت سے واقف نہیں ہوں لیکن معمولی عقل رکھتا ہوں۔ اتنے بڑے الزام کی تردید نہ ہونا اور خصوصاً اس وقت میں جبکہ خود اسی پارٹی کی حکومت ہو۔ اتنے بڑے فرد پر اتنا بڑا اعتراض عائد کیا جائے اور وہ نظری کر دیا جائے۔ کہاں تک عرض کروں۔ مولانا شبلی نے بھی آخر میں لکھ دیا “لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہو سکتیں” میں تو کہوں گا کہ مولانا شبلی مرحوم نے اس بات میں ذری دیر کر دی۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ مولانا کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔

شبلی مرحوم کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ایک وہ جو مولانا کے سفر مصر و شام وغیرہ کے پہلے لکھی گئیں، جیسے “المامون” وغیرہ جس میں ہر مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر نظر کی گئی ہے۔ اور دوسری وہ جو بعد کو شائع

ہوئیں۔ سیاحت کے پہلے شبلی نعمانی صاحب ویسے ہی مولوی تھے جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اس سفر نے مولانا کی آنکھیں کھول دیں۔ ابن خلدون نے تاریخ کا مقدمہ لکھ کر یورپ بھر کو تاریخ کی تعلیم دی تھی۔ ابن خلدون کی کتابیں تو ہر مولوی پڑھتا رہا تھا۔ مگر اس فلسفہ کو یورپ نے ہم سے پہلے اختیار کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تاریخ ملک کی تاریخ نہ رہی بلکہ اس پارٹی کی تاریخ ہو گئی جس پارٹی کے ممبر نے وہ تاریخ لکھی ہو۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایچ۔ جی۔ ویلس نے دنیا کی تاریخ لکھی ہے جو صرف سوشلسٹ کی عینک سے دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت دن ہوئے میکالے نے انگلستان کی تاریخ لکھی تھی جو خود ان کے زمانہ میں "وگ رسالہ" کے نام سے طنزیہ مشہور ہو گئی تھی۔ ابھی جواہر لال نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" لکھی ہے۔ جس نے قدیم ہندوستانی تہذیب کو اُن صفات سے آراستہ کیا ہے جو آج بھی ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ سمجھانے کے لیے عرض کر دوں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک مرثیہ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے قربانی وہی۔ حق پرستی وہی۔ آن بان وہی۔ ہر چیز وہی۔ مگر روس کی سوویت کو امام حسین علیہ السلام کے کارنامے بیان کر کے اور قوی کر دیا ہے۔ درایت کا کمال یہی ہے۔ جس کے موجد ابن خلدون تھے۔ خود بدنصیب ابن خلدون جیسے تھے وہ اُن کے حالات پڑھنے سے معلوم ہو گا۔ جعل اُنھوں نے بنایا۔ اغلام کی تہمت اُن کو لگی۔ خود غرضی۔ بے وفائی۔ نمک حرامی۔ ابن الوقتی تعصب۔ سلامتی سے سبھی باتوں کا ذکر سوانح حیات[1] میں موجود ہے۔ دوبرس

---

[1] ملاحظہ ہو ابن خلدون مرتبہ ایم۔ اے۔ اینان۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغۂ مطالع وزارت داخلہ۔ قاہرہ۔ اول لیکچرار شعبۂ ادب۔ فواد یونیورسٹی مصر صفحہ ۲۹۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۱۰۹ وغیرہ نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

جیل خانہ کو بھی جلوہ خانہ بنایا۔ مگر آدمی کی تصانیف اور آدمی کے افعال دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں مگر پھر بھی برتن سے وہی رسے گا جو اس میں ہوگا۔ اُن کے تقریباً تین سو برس بعد اٹلی میں میکاولی ہوئے جن کا نام تاریخ سیاست میں آجتک موجود ہی نہیں بلکہ جو آدمی پولیٹیکل چالوں سے آراستہ ہوتا ہے اس کو لوگ آج بھی میکاولی کہتے ہیں۔ اس کے صرف دو اقوال[1] سنئے "نمونہ خروارے" عرض کرتا ہوں۔ "آدمی کو زبان اس لیے دی گئی ہے کہ اپنے راز کو چھپائے نہ یہ کہ ظاہر کرے۔" "بادشاہ کو جو قید کرے اور مار نہ ڈالے وہ خود واجب القتل ہے۔"[2] مورخین ان کا موازنہ ابن خلدون سے کرتے ہیں اور ہر جگہ الفضل للمتقدم کے قائل ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم انگریزی تو جانتے نہ تھے جب اُنھوں نے فلسفۂ تاریخ ابن خلدون قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ میں عملاً برتے جاتے دیکھا تو اُنکی آنکھیں کھل گئیں اور اسی رنگ میں رنگ گئے اسکے پہلے سرسید مرحوم نے قرآن پاک کی تفسیر بالرائے کرنے میں بھی یہی کیا تھا۔ مگر مولانا شبلی نے جس پابندی اور خوبصورتی سے اس کو برتا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سو برس بعد حدیث قرطاس غلط ہوگئی۔ اور حضرت علی شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھا گئے گو پہلے بھی یہ ہوچکا تھا کہ حضرت علی نے ریشمی یا مخطط کرتا پہن لیا تھا اور ایک لڑائی میں کفار کو جلا دیا تھا۔ مگر پہلے یہ باتیں اس فلسفیانہ انداز میں کم تھیں۔ ہمارے بچپن میں ہر موقع پر پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا نام آتا تھا تب حضرت عمرؓ کا۔ جب سے مولانا شبلی سفر سے آئے لوگ ہر معاملہ میں پہلے حضرت عمر ہی کا نام لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب دل کے اندر

[1] میکاولی کی کتاب "دی پرنس" ز

---

[2] سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۳ [3] سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۶۳-۲۶۲ [4] تجرید البخاری ۱۲۲/۱

کوئی بڑا ایسا کچھ لکھتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق کا بھی نام آجاتا ہے۔ اسکے بعد درجہ بدرجہ سب خلفاء رضوان اللہ علیہم کا۔ اب مولوی شبلی اور ابن خلدون کی برکت سے ہر جگہ ہر بات میں حضرت عمر ہی کا نام پہلے آتا ہے۔ واقعی حضرت خلیفۂ ثانی کے کارنامے ایسے ہی ہیں۔ مولانا شبلی کے سفر کے پہلے کی کتابیں جیسے المامون اور بعد کی کتابیں جیسے الفاروق پڑھ کر ان کے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے میرے خیال کی غلطی یا صحت کا حال معلوم ہو جائے۔ مولانا نے سیرۃ میں "وانذر[1] عشیرتک الاقربین" کے ذکر میں جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے ممکن ہے قابل تاسف بھی ہو۔ اسلام کی تاریخ میں روایتوں کا توڑا کبھی نہیں رہا جسطرح کی خبر چاہیں مہیا کرلیں۔ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم ؎

"مرے قرآن پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تکبیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہئے"

جس مزاج کا لکھنے والا ہوا اسی طرح کا مواد موجود ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرت علی کی شراب پینے والی روایت سیدھی سیدھی لکھدی گئی۔ اور حدیث قرطاس جسکو سب نے لکھا ہے اسمیں تمام اصول درایت پیش ہوگئے۔ راقم ایک کم علم آدمی ہے۔ اور مولانا شبلی پر تنقید کر رہا ہے مگر شرط انصاف یہ ہے کہ خالی اس دلیل پر میری بات رد نہ کردی جائے۔ خود الفاروق کے دیباچہ میں مولانا نے جن جن باتوں کی رد کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اصول درایت کی توضیح کے سلسلہ میں جن تفصیلات کا ذکر کیا ہے جو تاریخ میں درآئے ہیں اور جن کو درست کرنا یا سدھارنا راوی کا فرض بتایا گیا ہے اس کو ناظرین صرف

---

[1] یہ واقعہ اتنی تاریخوں میں مذکور ہے کہ سب کے نام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ابوالفداء۔ طبری۔ تاریخ کامل وغیرہ وغیرہ۔ ،،

یہی نہیں کہ عبارت ہی پڑھ لیں بلکہ بین السطور جہاں معنی لکھے ہوتے ہیں ان پر بھی غور کریں اور یہ دیکھیں کہ مولانا نے کن باتوں کے رد کرنے کا تہیہ کیا ہے تو تعجب کیا ہے کہ میرا خیال بہادر ہوا نہ معلوم ہو۔ اکبر الہ آبادی مرحوم کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

سب وہ فتوحات نے ہر کہاں مشہوری پائی ہیں — تو تو ہو صرف سے ہی پیش نگاہ کا
وہ بھی فقط خیال سنت بعید۔ خیر — کیا بن سکے چراغ ہدایت کی راہ کا

میرے پڑھنے والے کہتے ہونگے کہ لکھنے والا تشیع کی عصبیت سے یہ کچھ لکھ رہا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میری تربیت شیعہ ہوئی ہے۔ مگر میری آرزو ہمیشہ یہ رہی کہ بجائے شیعہ یا سُنی ہونے کے مجھ کو خدا توفیق دیتا کہ میں مسلمان ہوتا۔ میں حضرت عمرؓ کا بڑا معترف ہوں گو حضرت ابوبکر صدیق کا زیادہ معترف ہوں حضرت عمرؓ کے بارے میں صرف دو باتیں ہیں جو میرے دل میں کھٹکا کرتی ہیں۔ ایک تو وہی جو میں عرض کر چکا ہوں یعنی خلیفۂ ثانی کو اہلبیت اور بنی ہاشم سے ایک طرح کی کد تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان حضرات میں مذہب کے معاملات میں تعاون نہ تھا۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ضرور ہے کہ حضرت عمرؓ ان حضرات کے صاحب اختیار ہونے کے خلاف ضرور تھے۔ دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ اگر آنحضرت صلعم دس بارہ برس اور جی جاتے، آیا تب بھی اسی قدر فتوحات ہوتیں؟ اتنی فتوحات اور اسلام کی اتنی ترقی جو حضرت خلیفۂ ثانی کے عہد میں ہوئی شاید ہی کسی تاریخ میں جسکی مثال ملتی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ سب فتوحات ہمیشہ دفاع کی صورت میں حاصل کی گئیں۔؟ میں تاریخ سے زیادہ واقف نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ جب دوسری قومیں بانیٔ اسلام پر اعتراض کرتی ہیں کہ اسلام تلوار

پہلا تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑے۔ جب نہاوند کی عظیم الشان مہم کے لیے مجلس شوری کا عام اجلاس ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا "اگر آپ لوگ ہماری مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا"۔ حضرت ابوہریرہ نے کہا "ہم آپ کو مدد دیں گے"۔ مگر حضرت ابوعبیدہ نے کہا "اے عمر! تم رسول کے اصحاب کو دنیا میں آلودہ کرنا چاہتے ہو" اور حضرت عمرؓ نے صرف یہ جواب دیا "میں ان بزرگوں سے نہ مدد لوں تو کس سے لوں"[1]

ہم جیسے تربیت کے آدمی آرام کرسی پر بیٹھے جسارت کی باتیں تو منہ سے نکال رہے ہیں۔ جس پر پڑے وہی جانے۔ اگر بفرض محال ہم صحیح بھی ہوں تو تمام فتوحات میں صرف خطا اجتہادی ہی ٹھیر گی۔ اللہ مجھ کو معاف کرے اور حضرت عمر مجھ کو معاف کریں میرے دل میں جو تھا وہ اگر نہ لکھتا تو میرا دل مجھ کو برا کہتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ حضرت عمر ہمیشہ ہر مسلمان کو آزادی سے اظہار خیال کی اجازت دیا کرتے تھے، اور ٹھنڈے کلیجہ سُن لینے کی کوشش کرتے تھے۔ ایران کے سلسلہ میں اُنھوں نے خود فرمایا ہے کہ[2] "ہمارے اور فارس کے بیچ میں آتشیں پہاڑ حائل ہوتا تو اچھا ہوتا"۔ اس کے آگے مولانا شبلی کہتے ہیں "لیکن فارس سے ایک اتفاقی طور پر جنگ چھڑ گئی"۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر وہی آتشیں پہاڑ حائل رہتا تو آج مسلمانوں میں تشیع اور تصوف کا زور نہ ہوتا جس نے اسلام کو بہت کچھ بدل دیا۔ سب کہنے کے بعد اتنا اور عرض کر دوں کہ اسلام کی عظمت و جبروت کے بارے میں جو حضرت عمرؓ کا احسان نہ مانے وہ ہٹ دھرم ہے۔

---

[1] الفاروق جلد دوم صفحہ ۲۰ - ۲۹ -

[2] الفاروق حصہ اول صفحہ ۱۹۶

اب ابن خلدون کی برکت سے ہر پہلو سے بات ٹھیک ہو گئی کچھ عجیب قصہ ہے۔ جناب امیر علیہ السلام رسول اللہ صلعم کی گود میں پلے۔ بیدار ذہن تھے۔ عالم بچپن کوئی بھی ذہن کا اندازہ تھا کہ تعلیم کا اثر قبول کریں مگر جب صحابہ کی لغزشیں ہوتی تھیں تو انہیں سے ہوتی تھیں لیکن جو کفر کی زندگیاں بسر بسر کر چکے تھے وہ ان لغزشوں سے پاک تھے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ حضرت علی معصوم تھے۔ اگر اس قسم کی لغزشیں بیان کی جائیں جیسے حضرت ابوذر غفاری کو رخصت کرتے جاتے ہوئے عمر عاص کی سواری کو کوڑا مار دینا تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں جو ایسا ہوا ہو لیکن جس وقت عربؓ میں بھی نیک لوگ تھے جو شراب چھوڑ چکے تھے اور جب حضرت عمرؓ تین بار شراب کے بارے میں پوچھیں اور ہر بار آیت اترے اور باوجود پہلا حکم آنے کے رسولؐ کے شاگرد خاص حضرت علیؑ ہی شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھا جائیں تو اسکو چاہے امام بخاری یقین کریں چاہے مولوی شبلی یقین کریں چاہے ابن خلدون میں تو نہیں یقین کر سکتا۔

مولانا نے سیرۃ النبی میں "وانذر عشیرتک الاقربین" کا ذکر صفحہ ۱۸ حصہ اول پر کیا ہے۔ مگر جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے۔ حالانکہ یہ اہم واقعہ تاریخ احمدی کی رو سے تفسیر معالم التنزیل میں منقول ہے اور دوسری کتابوں میں بھی اور میرے خیال کو مضبوط کرتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم وہی ابن خلدون والی سنت برتتے ہیں اور حضرت علیؑ کے مناقب بچا جاتے ہیں۔ ابن خلدون کی سنت سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو اصول

---

۵۱ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۱

۵۲ " " "

۵۳ الفاروق جلد اول صفحہ ۴۴

درائت جو ابن خلدون نے سکھائے ہیں۔ دعوت عشیرہ والی روایت میں یہ تخفیف اور حدیث قرطاس میں یہ پھیلاؤ وہی ابن خلدون کے تتبع کے خیال کو اور مضبوط کرتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ کمال تو یہ کر دیا ہے کہ شروع بحث میں عبداللہ ابن عباس کا کمسن ہونا ہونا اور اس موقع پر موجود نہ ہونا ثابت کر کے پوری روایت کو ختم کر دیا ہے اور آخر میں پھر فرما دیا ہے۔[1] لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس خیال سے مطابق نہیں ہو سکتیں۔

میرے پڑھنے والے!! خدا کے لیے یہ غور فرمائیں۔ حدیث قرطاس تو دفن کر چکے مگر صحیح بخاری کو باوجود اس تردید کے جو صحیح بخاری کی فرمائی گئی ہے، مسلم رکھا تاکہ آئندہ جب ضرورت پڑے تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ صحیح بخاری "اصح الکتب" بعد کلام باری نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ درائت کی نازک خیالیاں اور باریکیاں اب آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوں گی" یہ ابن خلدون کی" ابن خلدون نے درائت کو مستقل علم تو بنا دیا مگر یہ خیال نہ کیجئے گا کہ یہ فن بھونڈے طریقہ سے تاریخ اسلام میں نہیں برتا جاتا تھا۔ یہی درائت کی شقیں تھیں جس سے "والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم الخ" کی آیت سے چاروں خلافتوں کا علی الترتیب قرآن میں پہلے سے آ چکنا ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس آیۃ سے خلافتوں کی پیشین گوئی نکالنا شاعری برتنے والوں کی بزرگی ہے اور میں کیا کہوں۔ اگر یہ پیشین گوئی مان بھی لی جائے تو یہ آیۃ جن حضرات کے لیے آئی ہو گی ان کو اس کی تفسیر کی خبر آنحضرت صلعم ہی سے معلوم ہو چکی ہو گی مگر یہ دلیل ان حضرات نے کہیں پیش نہیں کی کہیں ارتداد کے پلٹنے کا ذر بیان کیا گیا، کہیں طوائف الملوکی سے حفظ، تقدم کی دلیل دی گئی حضرت ابو بکرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ یا علی اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم اسکے خلاف

---

[1] الفاروق حصہ اول صفحہ ۶۵۔

ہوگئے تو میں اُسکو قبول ہی نہ کرتا۔ یہ بھی فرمایا گیا کہ تمھاری قوم تمھارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ اور یہ پسند نہیں کرتی تھی کہ نبوت اور خلافت ایک ہی خاندان میں آجائے۔ مگر خدا کا حکم بنص صریح کی شکست دلیل کسی صاحب نے نہ پیش کی۔ پھر بھی آج اُسی آیہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ شیعہ حضرات سنیوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اُنھوں نے بھی قرآنِ شریعت کا معتد بہ حصہ حضرت علی کے مناقب کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہ وَرَسُوْلُہٗ الخ میں بیان کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے میں سائل کو انگوٹھی دیدی اُس پر یہ آیت اتری۔ جس شخص کے پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور اُسکو خبر نہ ہو وہی شخص نماز میں انگوٹھی دینے کا کثیر کام کر بیٹھے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے عبداللہ ابن یوسف علی کے ایسے لوگ تو ایسی آیتوں کو ہر ایسے مسلمان کے حق میں تصور کرتے ہیں جس کو اللہ ان نیکیوں کی توفیق دے۔ مگر حضرات شیعہ اور حضرات اہلسنت سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ہم بن پڑھے لکھے آدمی چپ ہیں۔ حالانکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اسکو معمولی عقل والا بھی سمجھ لیتا ہے۔

افسوس ہے کہ میں اس رسالہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مجمل ہی ہے۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو تاریخ کی کتابیں پڑھ کر وضاحت کا لطف اُٹھا سکتے ہیں میں تو اپنے ذہنی معیار کا اظہار کر رہا ہوں۔ لوگوں کو شیعہ سنی یا صوفی نہیں بنا رہا ہوں

مولانا نے ایک جگہ ہم کو مرعوب کرنے کے لیے فرمایا ہے "جو علم الرجال سے واقف ہیں" الخ۔ علم الرجال کا ایسا مہتم بالشان نام ہم ایسے جاہلوں کا مُنھ بند کر دینے کو کافی ہے۔ مگر جو حضرات جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ علم الرجال میں بڑے بڑوں کے نام ہیں جن کو دوسروں نے ناقابل اعتبار مانا ہے مگر پھر بھی امید رکھتا ہوں کہ اگر پیچ و تاب کھا کر زیادتی کر گیا ہوں تو مولانا شبلی

مجھے معاف کریں۔ اللہ مجھے معاف کرے اور آپ بھی درگذر کی کوشش کیجیے۔

خیر بھائی ہوگا۔ کسی کی خامیوں سے اسکی نیکیوں پر پانی نہیں پھر سکتا۔ ہر شخص کو پیش خدا اپنا حساب دینا ہے۔ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علی خلیفہ کر دیئے گئے۔ ہم خود اسوقت موجود نہ تھے۔ لیکن اگر حدیث قرطاس والی بات صحیح ہے تو ہم تو اسکو اچھا کہہ نہیں سکتے۔ رسول اللہ بیمار ہوں۔ سلیقہ کی بات فرمائیں۔ اور کہا جائے کہ بیماری کی شدت میں فرما رہے ہیں۔ تو ہم تو یقین کر سکتے نہیں۔ چاہے گلا ہی کٹ جائے۔ بات ناگوار قسم کی ہے۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔ اتنا اور عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ مولانا شبلی مورخ تو اچھے تھے ہی اگر وکیل ہوتے تو اور اچھے ہوتے۔

حضرت عثمان کی نیکی۔ نیک دلی۔ سخاوت۔ رسول مقبول سے محبت ایسی چیزیں ہیں جن کی تعریف جتنی کی جائے کم ہے۔ انتظام اُن کے وقت میں اچھا نہ ہوا۔ اس سے خود ان کو جو تکلیف ہوئی ظاہر ہے۔ مروان اور دوسرے بنی اُمیہ کے اختیارات وسیع ہو گئے۔ جن کو رسول خدا صلعم شہر سے نکال چکے تھے وہ واپس آ گئے۔ جن کو رسول صلعم قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یعنی ابوذر غفاری جیسے لوگ باہر بھیج دیئے گئے۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو گئی۔ میں تو بس یہ کہوں گا کہ شوریٰ میں آدمی ہی ایسے رکھے گئے تھے۔ کہ یہی ہو کے رہتا۔ اگر اُن آدمیوں میں مقداد۔ جابر۔ یا دوسرے جو تجہیز و تکفین رسول اللہ صلعم میں شریک تھے ہوتے یا عمار رضوان اللہ علیہم کے ایسے لوگ رکھے جاتے تو خلیفہ رسول کی شہادت نہ ہوتی۔ نہ ضعیف العمری میں رسول کا ایک چاہنے والا دنیا

تھا یہ تکلیفیں اُٹھا کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا۔ حضرت عثمان غنی کے کے ذمہ جتنے الزامات لگائے جاتے ہیں ان میں اخلاقی ذمہ داری ان کی ہی ہو مگر عملی ذمہ داری کا کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس کے ذریعے ان کے خلاف ڈگری عقل سلیم کی عدالت سے حاصل کی جا سکے۔ اسی کے مقابلہ میں ان کی خیرات ان کی نیکیاں، رسول صلعم سے ان کی محبت ایسی چیزیں ہیں جو خود ان کی اور انھیں کی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب امیر علیہ السلام کی خلافت ایک پہلو سے کامیاب کہی جا سکتی ہے اور ایک پہلو سے ناکامیاب۔ ناکامیاب تو اس پہلو سے کہی جا سکتی ہے کہ اسمیں سلطنت اور مقبوضات کی وسعت کم ہوئی۔ اور اس نظر سے کامیاب کہی جا سکتی ہے کہ نائب (علیہ السلام) منیب (صلعم) کے قدم بہ قدم چلا۔ رسول نے ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑا کئے۔ اور جناب امیرؑ علیہ السلام نے بھی ہمیشہ یہی کیا۔ "نعم المنیب ونعم النائب" اور پھر مملکت محروسہ سے کوئی مقبوضات کم بھی نہیں ہوئے۔ جتنے دن جیئے رسول کی پیروی کی۔ اسکے بعد ملک و مال روحانی امانتیں اور پیغمبر کی خاندانی خوبیاں وارث جائز کے سپرد کر کے اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرخرو حاضر ہو گئے۔ بعض لوگ دبی زبان سے قرآن کی تحریف کا ذکر کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ بحمد اللہ نہیں ہے کہ حضرت علیؑ ناقص قرآن کی ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لیتے اور خلافت ظاہری کیلیے ناقص قرآن کی ترویج دینے پر تیار ہو جاتے۔ میرے علی یعنی اس جاہل کے دل میں جناب امیر علیہ السلام کا جو نظریہ ہے اسکی رو سے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی ایسے قرآن کو ظاہری حکومت حاصل کرنے کے لیے قبول کر لیتے جو کیفیت مجموعی تمام احکام خدا اور منشاء رسول سے کچھ بھی الگ ہوتا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے وقت میں جب قرآن

جمع کیا گیا تو ممکن ہے کچھ ادھر کا اُدھر ہو گیا ہو مگر یہ میرا ایمان ہے۔ ایمان ہے کہ بین الدفتین قرآن وہی ہے جو خدا کے یہاں سے آیا ہے اور اس میں کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں ہے۔

شیعوں کے ہاں امامت من اللہ پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ خلافت کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ جناب امیر نے کبھی نہیں فرمایا کہ ہم کو آنحضرت صلعم خلیفہ بنا چکے ہیں (دیکھو صفحہ ۱۴) پھر دوسری جگہ حضرت عمرؓ کے حال میں عرض کیا ہے "کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علی خلیفہ کر دیئے گئے" (دیکھو صفحہ ۵۲) میرے خیالات کا پتہ تو ان جملوں ہی سے چل گیا۔ لیکن جن وجوہ سے میری سمجھ میں امامت من اللہ نہیں آتی وہ نہیں عرض کیا۔ حضرات شیعہ نہ معلوم کتنی آیتیں امامت من اللہ کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں مگر سب وہی آیتیں ہیں جنکے معنی میں اختلاف ہے۔ اتنا ضروری مسئلہ جو اصول دین میں شمار ہو اور ایک آیت بھی ایسی نہ پیش کی جا سکے جسمیں تاویل کی ضرورت نہ پڑے۔ وحدانیت نبوت۔ قیامت کے بہت سے احکام ہر جگہ موجود ہیں جن کے معنے میں کوئی فرقہ بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ فروع دین جن کا درجہ اصول دین سے کم ہے اُن کے احکام بھی اسی طرح کے صریحی ہیں جن میں اختلاف کی گنجایش نہیں مگر امامت من اللہ کے لیے ایک آیۃ بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جس کے معنی میں دوسرے مفہوم کا احتمال نہ ہو اور دوسرے فرقے اس کے دوسرے معنی نہ بیان کرتے ہوں۔ امامت من اللہ کے دلائل جو پیش کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر وہی آیت ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله والی پیش نظر ہو جاتی ہے۔ جو اس کتاب میں موجود ہے۔

محکم آیت جیسے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کی سی ایک آیت بھی نہیں جسکے

بدرجہ جبر کی گنجائش نہ رہ جائے۔ مولوی فرمان علی صاحب مرحوم مترجم قرآن پاک نے اپنے ترجمے کے حاشیہ پر سات آیتیں لکھی ہیں۔ جن سے امامت من اللہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ کو تو ایک آیہ بھی صریحی نہیں معلوم ہوتی۔ اتنا ضروری۔ اتنا اہم مسئلہ اور اس میں صرف تشبیہوں۔ استعاروں سے تاویل کی جائے کچھ دل پر بیٹھتی ہوئی بات نہیں ہے وہ آیتیں بھی لکھے دیتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمائیں۔ ان کے علاوہ حضرات ذاکرین اور آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ مگر ان میں بھی بغیر تاویل کے کام نہیں چلتا۔ اب وہ آیتیں پیش کرتا ہوں جو مولانا فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ پر لکھی ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیات در ثبوت امامت من اللہ

ماخوذ از قرآن مترجمہ مولانا فرمان علی صاحب

واذ ابتلی ابراهیم ربه بکلمت	(اے رسول) بنی اسرائیل کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب
فاتمهن ط قال انی جاعلک	ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور انہوں
للناس اماما ط قال ومن	نے پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے
ذریتی ط قال لا ینال	والا ہوں حضرت ابراہیم نے عرض کی اور میری اولاد سے
عهدی الظالمین ٥	فرمایا (ہاں مگر) میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی
	شخص فائز نہیں ہو سکتا۔
وقال لهم نبیهم ان الله قد	اور ان کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ بیشک خدا نے تمہاری
بعث لکم طالوت ملکا ط قالوا	درخواست کے مطابق طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا
انی یکون له الملک علینا	(تب) کہنے لگے اس کی حکومت ہم پر کیونکر ہو سکتی ہے۔

ونحن احق بالملك منه	حالانکہ سلطنت کے حقدار اس سے زیادہ تو ہم ہی ہیں کیونکہ
ولم يؤت سعة من المال	اُسے تو مال کے اعتبار سے بھی فارغ البالی تک،
قال ان الله اصطفه عليكم	نصیب نہیں (نبی نے) کہا خدا نے اُسے تم پر فضیلت
وزاده بسطة في العلم والجسم	دی ہے اور مال نہیں نہ سہی، مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو
والله يؤتي ملكه من يشاء ط	اسی کا خدا نے زیادہ فرمایا ہے۔ اور خدا اپنا ملک
وَاللهُ وَاسِعٌ عليم ○	جسے چاہے دے اور خدا بڑی گنجائش والا
	اور واقف کار ہے۔
فوجدا عبدا من عبادنا	تو وہاں مچھلی چھوڑی تھی، وہاں انہوں نے ہمارے
اتينه رحمة من عندنا	بندوں میں سے ایک (خاص) بندہ (خضر) کو پایا۔
وعلمنه من لَّدُنَّا علما ○	جسکو ہم نے اپنی بارگاہ رحمت (ولایت) کا حصہ عطا
	کیا تھا اور ہم نے اُسے علم لدنی (اپنے خاص علم)
	میں سے کچھ سکھایا۔
وجعلنهم ائمة يهدون	اور اُن سب کو (لوگوں) کا پیشوا بنایا کہ ہمارے
بامرنا واوحينا اليهم فعل	حکم سے (ان کی) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے
الخيرات واقام الصلوة وايتاء الزكوة	انکے پاس نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ
وكانوا لنا عبدين ○	دینے کی وحی بھیجی تھی اور یہ سب کے سب ہماری
	ہی عبادت کیا کرتے تھے۔
ولقد اتينا موسى الكتب	اور البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت)
وجعلنا مَعَهُ اَخَاهُ	عطا کی اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی
هرون وزيرا ج	ہارون کو (اُن کا) وزیر بنایا۔
فاما من تاب وامن و	مگر ہاں جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لایا

عمل صالحاً فعسیٰ ان یکون	اور اچھے کام کئے تو قریب ہے کہ یہ
من المفلحین ٥	لوگ اپنی مرادیں پانے والوں سے ہوں گے
شرع لکم من الدین ما	تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس پر چلنے کا
وصیٰ بہ نوحاً والذی	نوح کو حکم دیا تھا اور اے رسول اسی کی ہم نے تمہارے
اوحینا الیک وما وصینا بہ	پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا ابراہیم اور موسیٰ کو بھی حکم دیا تھا
ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ	وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا
ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ	جس دین کی طرف تم مشرکین کو بلاتے ہو
کبر علی المشرکین ما تدعوہم	وہ ان پر بہت شاق گزرتا ہے خدا جس کو
الیہ ط اللہ یجتبی الیہ من	چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے
یشاء ویہدی الیہ	اور جو اس کی طرف رجوع کرے (اپنی طرف)
من ینیب ٥	پہنچنے کا رستہ دکھا دیتا ہے۔

ایک بات جسارت کی اور عرض کر دوں۔ جناب امیر علیہ السلام سپاہی تھے۔ بہادر تھے، انوری نے کیا خوب کہا ہے ؎

ختم شد بر تو سخاوت، بر من مسکیں کلام
چوں شجاعت بر علی بر مصطفیٰ پیغمبری

آج تک فنون جنگ کے مشق کرنے والے لوگ "یا علی" استاذ کہکر اپنا حربہ اُٹھاتے ہیں مگر جنرل جن معنوں میں یہ لفظ سمجھا جاتا ہے انہیں تھے یعنی ہر مزاج والے کا دل یکساں طور سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیے رہ سکتے تھے۔ جو بیت المال کی چیزوں کے لیے اپنے سگے بھائی کو خفا کر دے۔ جو شخص لڑائی کے پہلے چراغ گل کر کے اپنے مددگاروں سے کہدے کہ دشمن صرف میرے خون کا پیاسا ہے۔ تم لوگ اگر چاہو تو اندھیرے میں

بغیر مروت توڑے جا سکتے ہوں۔ وہ حضرات جنرل کیسے ہو سکتے ہیں۔ صفین میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ نیزوں پر قرآن شریف دیکھ کر خود دینی فوج کے خیالات بدل گئے اور جناب امیر مجبور ہو گئے۔

چھٹا باب

بعض فلسفیوں کے نزدیک جناب باری تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد ایک انسان پیدا کرتا ہے جس کو سمجھنے کے لئے انسان فوق الانسان کہہ لیجئے۔ یہ انسان جسموں پر حکومت کر لیتا ہے اور دلوں پر بھی حکومت کر لیتا ہے اور ہر بات میں اسکو دوسرے انسانوں پر فوقیت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلعم ایسے ہی انسان تھے۔ شیعہ حضرات گو منہ سے صاف صاف نہیں سکتے مگر اپنے انداز سے یہ چاہتے ہیں کہ قرابت قریبہ کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام کو رسول صلعم کے برابر یا کچھ ویسا ہی مان لیا جائے۔ حضرات اہلسنت اس درجہ تک تو نہیں جاتے مگر وہ بھی حضرت عمرؓ کو کچھ انسان فوق الانسان ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صحیح بخاری ایسی کتاب میں اکثر روایتیں ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ اور حضرت عمرؓ میں اختلاف ہوا اور وحی حضرت عمر ہی کے خیال کے مطابق اتری۔ میرا عقیدہ ان باتوں سے بہت دور ہے۔ اور میں اپنے عقیدہ پر شرمندہ نہیں ہوں۔ اس ذات پاک رسالت سے کسی کو نسبت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ تو لوگوں کے منہ کی باتیں ہیں دنیا حاصل کرنے کو یا اپنے فرقہ کو فوق دینے کے لیے تزدہ بھی

---

[1] حدیث نمبر ۶۱۲ ۔ بخاری شریف صفحہ ۱۴۹ ۔ روایت از ابن عمرؓ مرتبہ صحیح مبارک ۔

کہا گیا ہے کہ مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

قرآن کا تو یہ دعویٰ کہ ایک آیت بھی کہہ لاؤ۔ فصحا تو اعتراف کر لیں کہ "لا ھذا الکلام البشر" اور راویان یہ فرمائیں۔ نہ ہوئے حضرت عمرؓ اس وقت نہیں تو راویوں کو بتاتے۔

امام حسن علیہ السلام کا ذکر اہلبیت کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ سنا ہے کہ امام ہمام علیہ السلام کی صورت اپنے نانا سے بہت ملتی تھی۔ " اللھم صل علی محمد و آل محمد" جناب امام حسن علیہ السلام اور جناب امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبع میں فرق تھا"

" الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ۵ کہ اللہ یحب المحسنین" کا واقعہ امام حسن علیہ السلام کے مزاج کا آئینہ ہے، (شہید انسانیت میں یہ روایت امام حسین علیہ السلام کے لیے لکھی ہے) امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبع کربلا کے میدان میں ظاہر ہی ہو چکی ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب امیر معاویہ کے بارے میں میرے خیالات سنیئے۔ وہ حکمت عملی کے بادشاد تھے۔ ذہین تھے۔ قریش تھے۔ خوبیوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا۔ کوئی دبی دبائی اچھائی ہمارے ایسے آدمی میں پڑی ہو تو تعجب نہیں مگر حضرت ان کے بارے میں میری زبان نہ کھلوائیے۔ نہ ان حضرات کے بارے میں میری رائے پوچھیے۔ جو ان کو اچھا کہتے ہیں۔ یہ جلیل القدر صحابی کہلاتے ہیں "صحابی کالنجوم" والی حدیث میرے گلے سے نہیں اترتی اور شاعر کی جبرا بازی ان کے ذکر پر پہنچ کر مجھ کو وہ تکلیف نہیں پہنچاتی جو ہر دوسرے موقع پر سے

صحابی گرچہ ہمہ کالنجوم اند   ولے بعضے کواکب نحس و نجوم اند

صحابی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جسکو رسول اللہ صلعم کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور وہ مسلمان ہو۔ ممکن ہے صحابی کی کوئی تعریف اور بھی ہو۔ جو مجھ کو نہ معلوم ہو۔ لیکن اسمیں کلام نہیں کہ ہر حالت میں اصحاب رسول اللہ رضوان اللہ علیہم کی تعداد بہت ٹھہرے گی۔ پڑھے لکھے حضرات کو وہ اخبار معلوم ہیں جن میں پیشینگوئی تھی کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں ہمیشہ تلوار کھینچی رہیگی۔ سورہ جمعہ میں "واذا نودی الصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" اور سورۃ برأت میں منافقین کا ذکر موجود ہے۔ خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے مسلمان کو مومن نہ کہو۔ "ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ نماز میں کوئی عورت آگئی تھی۔ کچھ نمازی پیچھے سے آگے چلے گئے اور کچھ آگے سے پیچھے چلے گئے۔ جو آگے تھے وہ رکوع میں اُس عورت کو بغل سے جھانکتے تھے اور جو پیچھے تھے وہ تو دیکھتے ہی تھے۔ اسی وقت یہ آیۃ اُتری۔

منافق مسلمان کے کوئی دم سینگ تو لگی نہیں ہوتی صرف خدا علیم بذات الصدور ہے ایسی صورت میں کالنجوم والی روایت کو ماننا میرے تو امکان سے باہر ہے۔

ان کے والد نے رسول اللہ کے دانت توڑے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے رسول اللہ کے چچا کا کلیجہ چبایا۔ یہ خود جناب امیر علیہ السلام سے لڑے اور غصب کیا کئے۔ ان کے برخوردار کے ہاتھوں کربلا کے میدان میں جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے روایت ہے کہ یزید علیہ اللعن کو نماز غفیلہ بتائی جس سے اس کے گناہ معاف ہو جائیں۔

اب آپ ہی بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان فیصلہ کیجئے۔ یہ کہہ دینا کہ ہم اپنی زبان سے کسی کو بُرا نہ کہیں گے تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ آپ مُنہ سے نہ کہئے۔ مگر دل تو آپ کا دو آدمیوں کے افعال کے بارے میں رائے قائم کرتا رہے ہی گا۔ اگر کوئی پھر بھی مرجیت بگھارے تو اس کی مثال اُس جولاہے کی سی ہوگی جسکے پاؤں میں تیر لگا تھا خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ "اللہ کرے جھوٹ ہو"۔ تبرا کے کڑکے اور کبت کہنا حماقت اور سخت گناہ ہے۔ بلکہ خود امیر معاویہ کی پیروی ہے۔ لیکن رائے کوئی کیسے رائے قائم نہ کریگا۔ حضرت عثمان اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو چھوڑ کر وہ وہ آدمیوں کا نمونہ گیت اس خاندان نے پیدا کئے ہیں کہ اللہ کی پناہ ع

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن اس اختلاف کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آپ امہات المومنین رضوان اللہ علیہن نہیں مگر بقول حکیم سنائی کے خال المومنین امیر معاویہ ہی کہلائے۔ حکیم سنائی کہتے ہیں کہ اتنے بڑے جلیل القدر صحابی تھے جن کی بہنیں امہات المومنین تھیں۔ مگر سوائے امیر معاویہ کے یہ لقب اور کسی کو نہ ملا۔ جو حضرات اس خطاب کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں یا جن کتابوں میں یہ لقب پسندیدگی سے آیا ہے۔ اگر دوسرے لوگ یا فرقہ ان حضرات اور ان کتابوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں تو کیا تعجب ہے۔ افسوس ہے کہ اسوقت میرے پاس حدیقہ حکیم سنائی جس سے مجھ کو بڑی ہدایت ملی ہے موجود نہیں۔ ورنہ خال المومنین کے ذکر کو وسعت دیتا۔ یہ وہی حکیم سنائی ہیں جن کے لئے مولانا کہتے ہیں ؎

عطار روح بود و سنائی دو چشم او   ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اور مثنوی میں فرماتے ہیں۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام　　از حکیم غزنوی بشنو تمام

اسکے لکھنے کے بعد ایک نسخہ حدیقہ کا ہاتھ آگیا۔ تفریح قلوب مومنین کیلئے کچھ اشعار خال المومنین کی مدح میں پیش ہیں۔

خال عکیس ز بود بر خورشید　　خال بر دیدہ بود لیک سپید
آنکہ مردود ہاؤ ابلیس است　　آں ز خال ودہ حرکہ ابلیس است
وانکہ خوانی کنوں معاویاش　　وانکہ در ہاریہ ست زادہ اش

اسکے بعد امہات المومنین رضوان اللہ علیہن کے اسماء گرامی گنوا کر فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ جفت مصطفیٰ بودند　　جملگی مادران ما بودند
ہریک را برادران بودند　　مصطفیٰ را بسان جاں بودند
از چہ مخصوص شد بخالی ما　　ابن سفیان زبان حالی ما

وجہ یہ ہوئی کہ احادیث کی تدوین آنحضرت صلعم کے بہت دنوں بعد شروع ہوئی۔ سب سے پہلی کتاب موطا ابن مالک ہے۔ جو تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد لکھی گئی۔ اسکے بعد امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے دوسری کتاب جسکو مسند کہتے ہیں لکھی۔ پہلی صدی کے شروع میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بھی حدیثوں کے لکھوانے کا سامان کیا تھا۔ اس زمانہ تک تو پتہ چلتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال صحیح کرنے کے لیے احادیث کا خیال کرتے تھے۔ تاکہ رسول اللہ صلعم کی سنت کے ذریعہ سے مسلمانوں کی زندگی قرآن کے موافق ہو جائے۔ سنہ ۱۹ھ میں حضرت اسمعیل بخاری پیدا ہوئے اور سنتہ ہجری میں انھوں نے صحیح بخاری کی بنا ڈالی۔ جو انھوں نے اٹھارہ سال کی محنت میں تیار کی۔ اب حدیث بنانے میں وہ مستقل رنگ اختیار کیا گیا جو آج تک چلا آتا ہے۔ حضرت بخاری کی کتاب کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ

اصح الکتب بعد کلام الباری الصحیح بخاری۔

میں نے تجرید البخاری مولفۂ علامہ حسین ابن مبارک زبیدیؒ کے دو مختلف نسخے دیکھے ہیں۔ حضرت بخاری رحمؒ کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ہر جگہ گھومتے تھے اور جہاں جہاں آپ کو کوئی معتبر راوی ملا اس سے حدیثیں سنتے تھے۔ حافظہ کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ احمد ابن جعفر والی خراسان روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ایک دن امام بخاری نے فرمایا کہ اکثر احادیث ایسی ہیں کہ میں نے بصرہ میں سنیں اور شام میں لکھی ہیں جو شام میں سنیں وہ بصرہ میں آ کر لکھیں۔ علی ابن الحسین البھکندی کا بیان ہے کہ حضرت امام بخاری ایک دن ہمارے یہاں تشریف لائے کسی نے ہماری مجلس میں کہا کہ میں نے حضرت اسحٰق بن راہویہ کو فرماتے سنا ہے کہ مجھے اپنی کتاب میں سے ستر ہزار حدیثیں تو اس وقت یاد ہیں حضرت امام نے یہ سن کر فرمایا تم لوگ اس پر تعجب کرتے ہو۔ بھلا جو شخص دس لاکھ حدیثیں یاد رکھتا ہے (گویا یہ اشارہ اپنی طرف تھا) اسی طرح یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضرت بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ہشام کے زمانے میں زہری اور دوسرے حضرات جنہوں نے حدیثیں جمع کیں۔ حافظ حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ شروع اسلام میں لوگ احادیث جمع کرتے ہوئے اس لیے ڈرتے تھے کہ کہیں حدیث قرآن شریف سے مخلوط نہ ہو جائے۔ مگر پھر تابعین کے زمانہ میں تدوین حدیث شروع ہو گئی۔ اکثر فقہا اور محدثین مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے اور روافض و خوارج اور قدریہ نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اس لیے جمع و تدوین فقہ کی طرف فقہا و محدثین کا خیال رجوع ہو گیا۔

یہ تمام باتیں اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں ایک شخص کیلئے صحیح ہوں مگر مجھ کو تو پروپیگنڈا سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں کوئی علم حدیث یا تاریخ پر تو کتاب لکھ نہیں رہا ہوں۔ میں تو اپنے خیالات کا اعتراف کر رہا ہوں اس لیے بحث کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ احادیث جمع کرنے میں یہ احتیاط برتی گئی اور زیادہ تر روایات کا رجحان کچھ ایسا ہے جس سے صرف فرقہ اہل سنت والجماعت کی تقویت ہوتی ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ صحاح ستہ میں سب روایتیں ایسی ہی ہیں۔ جب اسلامی تاریخ کا مدار ان پر ہو تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ مگر یہ تو ضرور کہوں گا کہ بہت سی روایتیں ایسی بھی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ امیر معاویہ کے وقت میں عبید ابن شریح کی کتاب ”کتاب الملوک و الاخبار“ اور وہب ابن منبہ کی کہانیاں اور کعب الاحبار کے قصے ہیں۔ یہی چڑیا چڑے کی کہانیاں تھیں جنھوں نے بعد کو بعید از قیاس معجزات اور قرآن کے برخلاف خرق عادات کی بنیاد ڈالی تھی۔ ابن ندیم کی ”الفہرست“ ابن خلکان اور نواوی وغیرہم کے بیانات[1] پڑھ لیجیے۔

بخاری میں خیبر کے متعلق پندرہ حدیثیں ہیں اس میں صرف ایک جگہ حضرت علیؑ کا نام آیا ہے وہ بھی اس طرح کہ حضرت علی ابن ابی طالب سے مروی ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلعم نے نکاح متعہ اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ ایک دوسری جگہ ایک دوسری سرخی کے تحت میں یہ بھی ہے کہ خیبر حضرت علی نے فتح کیا۔ میں اب اپنے دل کی بات کہہ دوں۔ خیبر کی لڑائی کا ذکر اور حضرت علی کا نام صرف سرسری

---

[1] ملاحظہ ہو حتی کی تاریخ عرب کا اکیسواں باب۔ جہاں بنی امیہ کے زمانہ میں علمی ترقیوں کا ذکر ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب مذہب اور باطنی تعلیم

طور سے آجانا میں تو اسی سے بھڑک گیا۔ کچھ اسی پر نہیں موقوف ہر جگہ یہی بات دکھائی دیتی ہے۔ امام حسنؓ کا نام کئی جگہ ہے کہ رسول صلعم کو ان سے بڑی محبت تھی اور حضرت ایک جگہ ضمناً امام حسینؑ کا ذکر ہے کہ حسنین میری دنیا کی زینت ہیں" ایک دوسری جگہ ہے کہ حضرت عمرؓ منبر پر تھے اور حضرت امام حسینؑ بچہ تھے۔ آپ نے کہا "ہمارے باپ کے منبر پر سے اترو" حضرت عمرؓ نے کہا "سچ کہتے ہو۔ منبر تمہارے باپ کا ہے" اس پر حضرت علیؓ نے کہا "میں نے بچہ کو یہ نہیں سکھایا ہے"۔ ممکن ہے کہیں اور بھی ہو مگر اس پر میری نظر نہیں پڑی۔ میں نے ہمیشہ اللہ میاں سے یہ دعا مانگی کہ شیعہ سنی سے بچہ کو چھٹکارہ دے کر اس مذہب کی ہدایت کرو جو آنحضرتؐ کے وقت میں تھا۔ جب ہر شخص مسلمان تھا۔ اور ہر شخص اہلسنت تھا۔ "الجماعت" کا ٹکڑا شائد امیر معاویہ کے وقت میں نکلا ہو کیونکہ انھوں نے اپنی حکومت کے پہلے سال کا نام "الجماعت" رکھا تھا[1]

حضرت علیؓ کا نام کئی جگہ ہے۔ مگر کہیں اس طرح ہے کہ حضرت علی نے کفار کو آگ میں جلوا دیا۔ اور کہیں ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا جس سے رسول کو بھی تکلیف ہوئی مگر بعد کو رک گئے[2]، امام حسن علیہ السلام کی منقبت میں ایک حدیث ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو ایک مرتبہ منبر پر دیکھا کہ حسن علیہ السلام ان کے پہلو میں تھے۔ آپ کبھی لوگوں سے کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فرماتے تھے "میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ سے دو بڑے گروہوں

---

[1] تاریخ خمیس و تاریخ الخلفاء سیوطی و عقد الفرید ابن عبد ربہ۔ کامل ابن اثیر و استیعاب ابن عبد البر۔ بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۲۲۵۔ [2] تجرید البخاری کتاب الصلح حدیث نمبر ۱۱۲۹

[3] تجرید البخاری فضائل صحابہ حدیث نمبر ۱۲۰۵

کے درمیان میں صلح کرادیگا۔"

ایک دوسری جگہ ہے حضرت اسامہ بن زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ اسامہ اور امام حسنؑ کو لیتے تھے اور فرماتے تھے "اللہ ان دونوں کو دوست رکھ کیونکہ میں ان دونوں کو دوست رکھتا ہوں" اتفاق دیکھئے کہ یہاں بھی بجائے امام حسین علیہ السلام کا ذکر دیا۔ اس طرح کی حدیثیں۔ میں تو صاف کہوں میرے دل پر بیٹھتی نہیں۔ میرے دل کو تو وہی بات دکھائی دیتی ہے جس سے میں ہمیشہ بھاگتا رہا۔ یعنی امام حسنؑ کی صلح سے امیر معاویہ کی ریشہ دوانیاں چھپ جاتی ہیں اور امام حسین علیہ السلام کی اتحاد جمیعت سے یزید باپ بیٹے کے ہتھکنڈے کھل جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے پیشینگوئیاں اگر ایسی ہوئیں جیسی سورۂ روم کے شروع میں ہے "غلبت الروم" یا قرآن شریف میں اور آئندہ کے اخبار میں وہ میرا ایمان ہے۔ مگر ایسی پیشینگوئیاں جو احادیث میں مذکور ہیں اور جن کا واسطہ قرآن سے کچھ نہیں ہے۔ یا بمقتضے اسباب و علل ان کا ظاہر ہونا عقل میں نہیں آتا۔ اور صرف پولیٹکل فائدہ کے لیے بیان ہو سکتی ہیں جیسے امام حسنؑ کا دو گروہوں میں صلح کروانا تو ان کے ماننے میں مجھ کو تامل ہے۔ قرآن شریف میں حسب ذیل آیتیں جو معجزات۔ کرامات۔ اور متذکرۂ بالا قسم کی چیزوں کے برخلاف پڑتی ہیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ اعراف ۲۳ع

اے محمدؐ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ "قیامت کب قائم ہوگی؟" تو کہہ اس کا علم میرے رب ہی کو ہے۔ اس کے وقت پر وہی اس کو ظاہر کرے گا۔ اے محمد کہہ میں اپنے ذاتی نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ اگر میں غیب داں

ہوتا تو بہت سا فائدہ اپنا کر لیتا اور مجھے کبھی گزند نہ پہونچتا۔

سورۃ رعد ۱ع

کفار تیرے بارے میں کہتے ہیں یہ اس پر اسکے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی تو محض ڈرانے والا ہے۔

سورۃ رعد ۴ع

اے محمد کفار کہتے ہیں کہ "اس پیغمبر پر کوئی نشانی (از قسم معجزہ) اسکے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتری" . . . . اگر قرآن ایسا نازل ہوتا کہ اسکے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے۔ یا اس سے ارضی مسافتیں طے ہو جایا کرتیں یا اسکی برکت سے مردے بولنے لگتے۔ جب بھی یہ لوگ رحمٰن سے انکار ہی کرتے۔

سورۃ انعام ۱ع

اے محمد ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی باتیں تجھے رنج دیتی ہیں۔ یہ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔ تیرے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے جھٹلانے پر اور ان کی ایذا پہ صبر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس پہونچی . . . اگر ان لوگوں کی سرکشی تجھے گراں گذرتی ہے تو تجھ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان کا کوئی کونہ ڈھونڈھ نکال اور پھر ان کو کوئی معجزہ لا دکھا۔

سورۃ انعام ۱۳ع

کفار بتاکید اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (معجزہ) ان کے سامنے آئے تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ اے محمد تو مسلمانوں سے کہدے کہ نشانیاں تو اللہ [illegible] کہ مسلمانوں تمھیں کیا [illegible] ہے [illegible] یہ لوگ

نشانیاں آئے پر بھی ایمان نہ لاویں گے۔

سورۃ جن ۲ع۔

اے محمد۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ بھی کہہ میں تمھیں ضرر یا نفع نہیں پہونچا سکتا یہ بھی کہہ مجھے اللہ کے غضب سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ میں اسکے سوا کوئی ٹھکانا پاتا ہوں۔ میں صرف اللہ کا پیغام پہونچاتا ہوں اور اسکی پیغام رسانی کرتا ہوں۔ اے محمد تو کہدے مجھے معلوم نہیں کہ عذاب موعود قریب ہے یا میرا رب اُسے ملتوی رکھے گا۔ وہی غیب کا جاننے والا ہے۔ اپنے غیب پر وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔ مگر برگزیدہ پیغمبروں کو اور وہ بھی اس طرح کہ اُن کے آگے اور اُن کے پیچھے دو فرشتوں کا پہرہ رکھتا ہے تاکہ اسے معلوم ہوتا رہے کہ پیغمبروں نے اپنے رب کے پیغام پہونچا دیئے۔

سورۃ آل عمران ۱۹ع۔

جو لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے کہہ رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ کرے جسے آگ آکر جلا دے۔ اے محمد تو ان سے کہہ کہ مجھ سے پہلے بہت سے رسول تمھارے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور یہ نشانی جو تم بیان کرتے ہو لیکر آئے تھے۔ تم سچے تھے تو تم نے انھیں کیوں قتل کیا؟ اے محمد اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تو برا نہ مان۔ تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول نشانیاں صحیفہ اور نورانی کتاب لیکر آئے تھے اور جھٹلائے گئے تھے۔

سورۃ بنی اسرائیل ۱۰ع

اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں مگر اکثر آدمی انکار کیے بغیر نہ رہے اور تجھ سے کہنے لگے۔ ہم تجھ پر اس وقت تک

ایمان نہ لائیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نکالے یا تیرے پاس
کوئی باغ کھجوروں یا انگوروں کا ایسا ہو کہ اُسکے بیچ بیچ میں تو نہریں جاری
کردے یا تو جیسا کہتا ہے آسمان کے ٹکڑے ہی ہم پر گرائے۔ یا اللہ کو اور فرشتوں
کو ہمارے سامنے لائے۔ یا تیرا گھر سونے کا ہو۔ یا آسمان پر چڑھ جائے اور آسمان پہ
تیرا چڑھنا ہم باور نہ کریں گے جب تک تو کوئی ایسی کتاب ہم پر نازل نہ کرے
جسے ہم پڑھ سکیں۔ تو کہہ۔ سبحان اللہ۔ میں کیا ہوں۔ ایک بشر ہوں اللہ
کا بھیجا ہوا۔

سورہ یونس ۲ع۔ اہل مکہ کہتے ہیں محمد پر کوئی نشانی اسکے رب کے پاس سے
کیوں نہیں آئی۔ اے محمد تو کہہ۔ غیب اللہ ہی جانتا ہے۔ تم منتظر رہو
میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

سورۃ انبیاء۔ ۱ع

اگر یہ پیغمبر ہے تو جسطرح اگلے پیغمبروں کے ساتھ معجزے آئے تھے یہ
بھی ویسا ہی معجزہ دکھائے ہم نے اُسکے پہلے جن بستیوں کو ہلاک کیا انکے
باشندے معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟ اے محمد
پیشتر تیرے قبل بھی آدمی رسول بنا کر بھیجے تھے اور ان کی طرف ہم وحی بھیجتے
تھے۔ لوگو اگر تمہیں معلوم نہیں ہے تو اہل کتاب سے پوچھو۔ ان رسولوں کے
جسم ایسے نہ تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور ہمیشہ زندہ رہیں۔

ساتواں باب

میں معجزوں کا کلیۃً منکر نہیں ہوں۔ مثلاً دل سے قائل ہوں کہ قرآن شریف خود معجزہ ہے۔ یا جو پیشینگوئیاں بربنائے عقل و دور اندیشی عاقل ترین البشر (صلعم) نے فرمائیں۔ اگر آپ کا دل چاہے ان کو بھی معجزہ کہہ لیجیے۔ مگر جب قرآن شریف کی مختلف آیتوں میں وہ کہا جائے جو گذشتہ آیتوں میں یہ ناچیز نقل کر چکا ہے تو پھر تو میری سمجھ میں وہ معجزات نہیں آسکتے جو صرف احادیث میں مذکور ہیں۔ اور جن کا پتہ قرآن شریف میں نہیں۔ معلوم کتنے معجزات پانی کے متعلق کھانے کے متعلق احادیث میں مذکور ہیں جن کا قرآن میں کہیں حوالہ نہیں۔ قرآن شریف میں کفار کو جناب باری نے سمجھایا ہے مگر باوجود اسکے کفار معجزہ مانگا ہی کیے۔ جناب باری نے کفار کو قائل کرنے کے لیے ان معجزات کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں! جن سے سنی شیعہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزے قرآن شریف میں مذکور ہیں تو آنحضرت صلعم کے معجزے کیوں نہ مانے جائیں۔ میری تردید کیلیے صرف یہ دلیل تو کافی نہ ہوگی انبیاء ما سبق کے معجزے قانونی نظیر کی صورت میں ہرگز نہیں پیش کیے جا سکتے نظیر اسی وقت مانی جائیگی جب قانون موجود ہو۔ اگر خود قانون ہی نہیں

موجود ہے تو نظیر کیا کام دے سکتی ہے۔ خالی خوش عقیدگی سے تو کام نہ چلے گا۔ اور اسکے بعد بھی ہر معجزے کے لیۓ ویسا ہی ثبوت بہم پہونچ جانے جیسا مثلاً قرآن شریف کے لیے ہے۔ یا معجزہ غلبۃ الروم کے لیے ہے میں صرف ان معجزوں پر اعتراض کر رہا ہوں جو احادیث میں ہیں۔ اور خود قرآن میں نہیں ہیں۔ اگر کوئی ناواقف بھی قرآن شریف کے مانے ہوئے معجزے میری تردید میں پیش کرے تو وہ المدعے شق مصادرہ کے مغالطہ میں پڑ جائیگا۔ شق القمر اور معراج کے معجزے ایسے ہیں جن میں بڑے بڑے علما ہمیشہ شک کرتے آئے ہیں۔ وہ بھی میری دلیل کے خلاف پیش نہیں کئے جا سکتے۔ شق القمر کے لیے دو تین رائیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ دوسرا مذہب یہ کہتا ہے کہ قیامت کے قریب ہو گا اور ماضی کا صیغہ خطابت کے قاعدے کے موافق مستقبل کیلیے استعمال ہوا ہے۔ یہ طریقہ خطابت ایک دوسری سورۂ "اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون" میں بھی موجود ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اسکے معنی ہیں کہ قرآن کا جو دعوی ہے وہ آئینہ کی طرح صاف ہو گیا یعنی قرآن کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوۓ ہیں جو لوگ دوسرے معنی کے قائل ہیں وہ سورۂ قیامت کی آٹھویں اور نویں آیتیں اپنے خیال کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں

وخسف القمر ○ وجمع — اور چاند بے نور ہو جائیگا ○ اور آفتاب اور
الشمس والقمر ○ یقول الانسان — ماہتاب یکجا کئے جائیں گے ○ اس دن انسان
یومئذ این المفر ○ — پوچھیگا "آج کہیں جائے گریز ہے؟"

زمانۂ جاہلیت کا ایک مصرع بھی یہاں کہا جاتا ہے۔ شاید

امراء القیس کا کہا جاتا ہے "دنت الساعۃ وانشق القمر" اقرب کے پہلے الف لام ہے یا نہیں مجھ کو نہیں معلوم۔ اسکے ترجمے تو قریب ہی ہی سی شک بچتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امراء القیس کی پوتی نے "اقترب" کی داد دی تھی۔

معراج کے مسئلہ میں بھی جسمانی اور روحانی معراج کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ ہم ایسے کم علم مغرب زدہ لوگ حسب منشاء قرآن پیغمبر اسلام کے لیے معجزے کی ضرورت تصور نہیں کرتے۔ نہ صرف احادیث مروجہ کی بناء پر ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اندھیرے کی بات ہے۔ سنی شیعہ ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ اور ان کے علماء نفرت کے مختلف جذبے ایک دوسرے کے لیے ابھارتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے کے تسلیم شدہ معجزوں پر اعتراض کم کرتے ہیں۔ میرے خیال میں صرف اسی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں دونوں کی کور دبی ہے۔ مناظرہ کی کتابیں دیکھ لیجئے۔ سخت سے سخت باتیں ایک دوسرے کو کہیں گے۔ اور ایک دوسرے کو جہنم میں دھکیل کر خود بہشت میں علی الاعلان حوروں کو پہلو میں لیکر بیٹھ جائیں گے۔ مگر ایک دوسروں کے بیان کردہ معجزوں کو کم جھٹلائیں گے

جاہلوں کے لیے ایک اور ترکیب ایجاد کی ہے یعنی پیغمبر سے معجزہ ہوتا ہے اور دوسروں سے کرامتیں عمل میں آتی ہیں یعنی مطلب یہ کہ مقلدین بھڑک نہ جائیں اور اسی دھوکہ میں رہیں کہ معجزہ بڑی چیز ہے اور کرامت کا تو درجہ کم ہے۔ پوچھو جب خرق عادت دونوں ہیں تو ذرا سا نام یا چھوٹا رکھنے سے اصل چیز یعنی خرق عادت میں کیسے فرق پڑ جائیگا۔ ایک مثل ہے جو لوگ شیشہ کے مکانوں میں رہتے ہیں وہ ڈھیلے نہ پھینکا کریں۔ اگر یہ حضرات ایک دوسرے پر اعتراض سے اسی بناء پر دور رہتے ہیں تو واقعی بڑی فراست اور سمجھداری

بات کرتے ہیں۔

بچپن سے مجالس عزا میں نہ معلوم کتنے معجزات سنتا چلا آیا ہوں۔ آخر کار اتنا پریشان ہو گیا کہ بھاگ نکلا۔ بخاری کا نام خصوصاً اور صحاح ستہ کا نام عموماً سنا کرتا تھا۔ انہیں دنوں ان کی طرف رجوع کیا۔ تقریباً وہی حدیثیں ہیں جو تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔ بخاری میں بھی ہیں۔ لہٰذا میں نے ان کتابوں میں نمبر اول کتاب لی اور اسکو بار بار پڑھا۔ مگر میری بدقسمتی کہ جو کچھ میں ڈھونڈھتا ہوں وہ نہ ملا۔ اسمیں سیکڑوں احادیث ہیں جو سنی، شیعہ، وہابی کی پولیٹیکل چالوں کی ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں امام بخاری پیدا ہوئے۔ انھوں نے کئی اور بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ رسول صلعم کے زمانہ سے اسوقت تک اگر فی صدی تین پشتیں رکھی جائیں تو کم سے کم پانچ پشتیں ہو چکی ہیں۔ گو حدیثوں کے لکھنے کا سلسلہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے وقت سے شروع ہو چکا تھا۔ مگر امام بخاری نے اٹھارہ برس کی محنت کر کے حدیثیں جمع کیں جسمیں سنا کا لفظ ہر جگہ استعمال ہوا ہے۔ دنیا بہت بدل چکی تھی رسول اللہ صلعم اور خلفاء اربعہ کے زمانہ کے دیکھنے والے نہ معلوم کب ختم ہو چکے تھے۔ نبیذ خالی اس بات پر پی جاتی تھی کہ کبھی لوگوں نے کسی ڈالی میں پانی کے بہت کھاری ہونے کی شکایت کی تھی۔ اور آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ اسمیں کھجوریں ڈالدو۔ بنی امیہ ختم ہو چکے تھے۔ شیعہ بھی دبے دبائے [illegible] بیٹھے تھے۔ بنی عباس کا زمانہ تھا۔ [illegible] کی کتابیں روضۃ الکبریٰ وغیرہ سے ترجمہ [illegible] ہو رہی تھیں۔ [illegible] عرب خیالات سے [illegible] اور ایران کی تجلیاں چھا رہی تھیں۔ ایسی حالت میں کسی کتاب کا بغیر ان چیزوں سے متاثر ہوئے لکھا جانا بہت مشکل تھا۔ بنی امیہ ہی کے وقت میں حدیثوں کی بھرمار

ہوچکا تھی اور اب زیادہ ہو گئی۔ میرے استاد پروفیسر نواب علی مشہور مصنف جنہوں نے بہت سی کتابیں حدیث پر لکھی ہیں، پہلے شیعہ تھے۔ بعد کو سنی ہوگئے۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہشام اموی نے امام زہری کو لکھا کہ جتنی روایتیں حضرت علی کی منقصت میں اور جتنی روایتیں حضرت عثمان کی منقبت میں ہوں فراہم کر دو۔ ان کو اتنا بُرا معلوم ہوا کہ خلیفہ کا رقعہ انہوں نے بکری کے منہ میں ٹھونس دیا جو پاس بندھی تھی۔ مگر خلیفہ کو جواب لکھنا ہی پڑا۔ انہوں نے لکھا کہ "خلیفہ کو معلوم ہو کہ حضرت علی کی منقصت سے ان کو کوئی نقصان نہ ہوگا اور حضرت عثمان کی منقبت سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میں اپنی یاد پر لکھ رہا ہوں۔ گو اس بڑھاپے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ میرا حافظہ غنیمت ہے۔ پھر بھی اگر میں غلط کہہ گیا ہوں تو میرے اُستاد اور مسلمان اور میرا خدا مجھ کو معاف کرے۔

پانچ پانچ پشتوں تک ہر راوی کا حافظہ کہیں غلطی نہ کرے، یہ بات حضرت حضرت امام بخاری کو اور اُن کے راویوں ہی کو مبارک ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ایک بات ہم دوسرے سے کہتے ہیں۔ دوسرا تیسرے سے کہتا ہے تیسرا ہم سے تصدیق کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں "بالکل ٹھیک ہے۔ صرف ذرا سا فرق ہوگیا ہے۔ میرا مفہوم یہ تھا"۔ اس قول پر ہم تینوں میں سے کوئی کسی کی نیت پر شک نہیں کرتا۔ اور بات سلجھ جاتی ہے۔ اب آپ ہی خدا لگتی فرمائیے کہ پانچ پانچ پشتوں تک بھی جو [illegible] کوئی کہیں غلطی نہ کرے کیسے [illegible] بات جو رسول محمد صلعم سے تو [illegible] فرمائیں [illegible] تو آپ کے بعد ان نا انصافوں کے پاس نہ پہنچی اور حضرت امام بخاری

ـلہ بخاری میں زیادہ تر تین ہی تین آدمی دکھائی دیتے ہیں کہیں کہیں چار بھی ہیں [illegible] عام [illegible]

کے راوی کہیں غلطی نہ کریں۔ جن لوگوں کو لکھنے کی عادت نہیں ہوتی جیسے عربوں کا حال تھا کیونکہ کاغذ اسوقت تک چین سے نہ آیا تھا۔ ان کا حافظہ اور لوگوں سے قوی ہوتا ہے۔ مگر جب تک انسان معصوم عن الخطاء نہ پیدا کیا گیا ہو۔ اسوقت تک اسپر اتنا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ آدمی ان اقوال پر اپنا راستہ خدا کے سامنے جانیکا تیار کرے۔ پھر یہ بھی لحاظ کرنے کی بات ہے کہ بنی امیہ کا زمانہ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں گزر چکا تھا۔ بنی عباس کی روز ترقی عروج الکمال کو پہونچ چکی تھی۔ اور ہر شخص انھیں احادیث کی بنا پر بنانا اگر عقیدے کے لیے نہیں تو دنیا کے لیے ضرور ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس جگہ تھوڑی سی عبارت حتی کی تاریخ عرب سے نقل کرتا ہوں۔ حتی نے زمانہ موجودہ میں تاریخ عرب انگریزی میں لکھی ہے جسکو پڑھے لکھے لوگ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ مورخ عرب ہے اور مذہبًا عیسائی ہے۔ اور پرنسٹن کی یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہے۔ رحلت رسولؐ کے ڈھائی سو برس کے اندر آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال کی فہرست جو از روئے بُعدِ زمانہ وجہ از روئے ترتیب برابر بڑھتی گئیں۔ جب کوئی مسئلہ مذہبی۔ سیاسی یا معاشرتی پیش آیا تو ہر دو فریق معاملہ نے یہ کوشش کی کہ کوئی کلام یا حکم رسول اللہ سے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں لائے۔ واقعی ہو یا فرضی۔ اس سے مطلب نہیں حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا سیاسی معاملہ۔ امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کے درمیانی جھگڑے۔ اموی اور عباسی عناد۔ عرب اور عجم کی برتری کا مسئلہ۔ یا اسی طرح کی دوسری ضرورتوں کی وجہ سے حدیثیں گڑھنے اور ان کی اشاعت کی ضرورت پڑی۔ اسکے علاوہ حدیثیں تیار کرنا منفعت کی رو سے بھی نہایت ہے۔ علما حدیث لکھنے کے ذریعہ سے آرام کی زندگیاں بسر کرتے تھے۔ [illegible]

جب ابن ابی العوجا کو سزائے موت دی گئی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ میں نے چار ہزار خود اپنی موضوعہ احادیث کی اشاعت کی ہے۔[1] عموماً مدنی احادیث کو کوفی احادیث پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں بھی سب شک سے بالاتر نہیں ہیں۔ مثلاً ابوہریرہ صحابی رسول کے اقوال اور افعال کے بڑی پُرجوش اشاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی بابت مشہور ہے کہ انھوں نے پانچ ہزار تین سو روایتیں بیان کیں۔ بہت سی احادیث ان میں مانی ہوئی ایسی تھیں جو حضرت ابوہریرہ کے بعد اُن کے ذمہ ڈال دی گئیں۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے دو ہزار دو سو دس حدیثیں بیان کیں۔ انس ابن مالک نے دو ہزار دو سو چھیاسی احادیث بیان کیں۔ حضرت عبداللہؓ ابن عمر سے ایک ہزار چھ سو تیس احادیث مروی ہیں۔

سب سے زیادہ متحیر کرنے والی بات صحیح بخاری وغیرہ میں ایک اور بھی ہے۔ یعنی اکثر آیات قرآنی حضرت عمر کے خیال کے مطابق نازل ہوئیں جب کبھی رسول اللہ صلعم اور حضرت عمر کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو حکم خدا حضرت عمر کے خیال کے موافق آیا۔ حضرت عمر کے بہت بڑے آدمی ہونے میں اور رسول اللہ صلعم کو چھوڑ کر اسلام کے سب سے بڑے عالی دماغ سب سے بڑے مدبر اور سب سے بڑے سیاست داں ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ اسلام کے ساتھ آپ کی دلسوزی بھی مانی ہوئی بات ہے۔ مگر اختلاف کے وقت وحی کا اُن کے خیال کے موافق نازل ہونا ایک عجیب بات ہے۔[2] اس میں شک نہیں جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں

---

[1] طبری بحوالہ ابن الاثیر۔

[2] بحوالہ نودی۔

کہ آنحضرت صلعم انسان فوق الانسان تھے۔ ان کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس طرح کی باتیں مان لینے کے بعد قرآن کا درجہ عیاذً باللہ گیارہ جاتا ہے۔ جب عبداللہ ابن ابی مرگیا تو اس کے بیٹے نے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھ کو اپنا کرتہ دیجئے جس میں اُسے کفن دیا جائے اور اُسکی نماز پڑھیے اور اسکے لیے بخشش کی دعا مانگئے۔ آپ نے اپنا کرتہ دیدیا اور فرمایا کہ جب جنازہ تیار ہو جائے مجھے اطلاع دینا۔ میں اسکی نماز پڑھ دوں گا چنانچہ اس نے آپ کو اطلاع دی۔ مگر جب آپ نے چاہا کہ اسکی نماز پڑھیں تو حضرت عمر نے روک دیا اور کہا کہ کیا منافقین پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے اللہ نے آپ کو منع نہیں کیا ہے۔ جس آپ نے فرمایا تب مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا اور اللہ کا ارشاد ہے۔

استغفر[۱] لهم او لا تستغفر لهم ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم

پس آپ نے اسکی نماز پڑھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ولا تصل على احد منهم مات ابدا[۲]

اور اس طرح کی اور روایتیں بھی ہیں۔ دل کے اوپر اور عقل کے اوپر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کی روایات قرآن کو اور دین کو کمزور کرتی ہیں اور فرقوں کو مضبوط کرتی ہیں۔ اور تو کبھی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔

---

[۱] بخاری۔ حصہ اول۔ حدیث نمبر ۳۰۸ صفحہ ۲۵۴ میں ملاحظہ ہو۔ ترجمہ: (تم انکے لیے طلب مغفرت کرو یا نہ کرو۔ دونوں برابر ہیں) اگر ستر بار ان گناہوں کی معافی چاہوگے تو خدا ہرگز معاف نہیں کریگا۔

[۲] صحیح بخاری۔ حصہ اول۔ باب البدع اذان۔ حدیث نمبر ۳۲۳۔

اذان کے معاملہ میں بھی حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ آدمی کے ذریعہ سے اعلان حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق ہے ہوا۔ اسمیں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اسکے متعلق ایک روایت ہے جسکو لکھتے اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر لکھنا پڑے گی۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ آئے تو نماز کے وقت کا اندازہ کرکے لوگ نماز کے لیے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ کیونکہ نماز کے لیے اعلان نہ ہوتا تھا۔ پس ایک دن مسلمانوں نے اس بارے میں گفتگو کی۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ نصاریٰ کے ناقوس کی طرح ناقوس بناؤ۔ بعض نے یہود کے سنکھ کی طرح سنکھ بنانے کی رائے دی۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ کوئی آدمی کیوں نہیں مقرر کر دیتے کہ وہ الصلوٰۃ پکار دیا کرے۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا "بلال اٹھو۔ نماز کی اطلاع کر دو۔ اسکے بعد ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا "جب نماز کی اذان کہی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے اور خوف کے مارے اُسے گوز ہو جاتا ہے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم) تاکہ اذان کی آواز نہ سُنے۔ پھر جب اذان کی آواز ختم ہو جاتی ہے تو سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نماز کی اقامت کہی جاتی ہے تو پیٹھ دیکر بھاگتا ہے۔ اور ختم اقامت پر پھر موجود ہوتا ہے تاکہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان وسوسہ ڈالے۔ اور کہتا ہے فلاں بات یاد کرو۔ فلاں بات یاد کرو۔ یعنی وہ باتیں جو اسکو یاد نہ تھیں۔ حتیٰ کہ انسان بھول جاتا ہے کہ اس نے کسقدر نماز پڑھی۔

غور فرمائیے اللہ کی بھیجی ہوئی نماز۔ رسول کی لائی ہوئی نماز میں تو شیطان جیسا کہ اسکو قیامت تک کی مہلت دی گئی ہے وسوسہ

ڈالے گر اذان میں وہ مہلت ملتوی ہوجا۔

واضح ہوکہ میں اذان میں نہ "اشہد ان امیر المومنین امام المتقین علی ولی اللہ وصی رسول وخلیفۃ بلا فصل" کہتا ہوں نہ "الصلوٰۃ خیر من النوم"

ساتواں باب

ارے صاحب کہاں تک اس کا رونا رویا جائے، علاوہ اثنا عشری کے نہ معلوم کتنے فرقے گذرے ہیں جو اس سے بھی آگے گئے ہیں اللہ غضب تو یہ ہے کہ پیسہ کمانے کے شوق میں اثنا عشری واعظین اپنے اوپر وہ باتیں اوڑھ لیتے ہیں جو ان کے مذہب میں کہیں داخل نہیں۔ نصیریوں کے عقائد اگر صاف نہیں تو اشارۃً کنایتاً کہہ گذرتے ہیں۔ کسی فرانسیسی نے کہا ہے "حماقت کی باتیں جو یوں نہیں کہی جا سکتیں گا کر کہہ سکتے ہو"۔ یعنی نظم میں کہہ سکتے ہیں۔ نہ معلوم کتنے اشعار پڑھے جاتے ہیں جو انھیں غلاۃ کے عقائد سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ حضرات مجلس کی واہ واہ میں یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اپنے ساتھ شیعوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ نصیریوں کے یہاں بہت سی ایسی باتیں داخل مذہب ہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہب کے اصول راز میں رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً تین لاکھ ہوں گے جو شمالی اور وسطی شام کے پہاڑوں کے سلسلے میں پھیلے ہوئے ہیں اور پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد سے فرانسیسیوں کے تحت میں رہتے تھے۔ اب خود شام والوں کی آزاد حکومت ہے۔ یہ مذہب بقول چند مصنفین عیسائیوں سے کسب کیا گیا ہے

کے نام بھی اکثر انجیل کے ناموں پر ہوتے ہیں۔ اور عید غدیر وغیرہ منانے کے ساتھ ساتھ کرسمس، ایسٹر اور دوسرے عیسائی تہوار بھی مناتے ہیں تثلیث کی کھال کھینچ اسمعیلیہ فرقہ کے عقائد کے ساتھ ایک نئے رنگ سے کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ۔ رسول اللہ صلعم۔ اور جناب سلمان۔ چاند۔ سورج۔ ستارہ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی مذہبی کتاب کا نام المجموع ہے۔ ترکی اور اناطولیہ میں ایک اور فرقہ ہے۔ جن کو حروفی کہتے ہیں اور بیگتاشی بھی کہتے ہیں۔ ایک اور فرقہ ہے جو نصیریوں سے علیحدہ ہے اور ان کو علی اللّٰہی کہتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی اناطولیہ اور ترکستان کے قریب موجود ہے۔ یہ فرقہ بیگتاشی اور نصیریوں سے عقائدی تعلقات رکھتا ہے۔ اور مذہبی عقائد کو راز رکھنا ان لوگوں میں بھی عام ہے۔ ان کے یہاں ایک اور رسم کہی جاتی ہے۔ یعنی چراغ گل کر کے افعال شنیعہ میں بے تکلف حصہ لیتے ہیں۔ انھیں مضافات یعنی روس اور ترکستان کی قدیم تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے سے ان لوگوں میں اندھیرے میں ناچنے کا رواج تھا۔ یہ اکثر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسی طرح کی ایک پوجا ہوتی تھی جسکو شاکتی پوجا کہتے تھے۔ جو از روئے انسائیکلوپیڈیا چھپا کر ہوتی تھی۔ اب شاید نہیں ہوتی۔ ایک پڑھے لکھے ہندو دوست اس کا فلسفہ مجھ کو اسطرح سمجھا رہے تھے کہ جس سے شک ہوتا تھا کہ شاید اب بھی ہوتا ہو تو تعجب نہیں۔ خیر ہندوؤں کا حال تو جملہ معترضہ کے طور پر آگیا تھا۔ ذکر تو چراغ کشاں کا تھا۔ اسلام میں حال وقال کا سلسلہ بھی قونیہ سے شروع ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا میں اس کا حال بھی اور تصویر بھی ہے۔ جیولاکس ملیس کی مشہور معروف

کتاب نفیسات جنسی میں اس کا ذکر ہے۔

اسلام میں حال وقال کا سلسلہ مولانا روم کے وقت سے شروع ہوا۔ آیا یہ حال وقال جزو اسلام ہے یا نہیں۔ یہ غور کرنے کی بات ہو۔ ایک مقام پر آگے یا پیچھے میں نے عرض کیا ہے کہ حکیم سنائی تک تصوف میری سمجھ میں آتا ہے۔ اسکے آگے نہیں آتا۔ میرے اس قول کی یہی وجہ تھی۔ اگر کہیں یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلعم یا حضرت علیؓ یا حضرت ابوبکرؓ نے یہ کیا ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں نہیں تو حضرت مجھ کو تو معاف ہی رکھیئے۔ حال وقال کی محفل میں مجھ کو بھی لطف آیا ہے۔ اور ان تقریبات میں بہت حصہ لیتا رہا۔ اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیکن غور کرنے سے پتہ چلا کہ لطف روحانی پہلو کا نہ تھا۔ بلکہ عارض و گل و شراب محبت، عشق و وصال کے اذکار سے تھا۔

روزہا رفت کہ دست من مسکیں نہ گرفت
ساق شمشاد قدے ساعد سیم اندامے

اگر آپ کو بھی حافظ کا یہ شعر مزہ دے گیا ہو تو میں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ ذری سنبھل کر مزے لیجیے گا۔ اور یکبارگی یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ خالی زبان قبض کی شکایت ہے اور حالت بست کی آرزو ہے۔ اسکی پہچان بھی بتا دوں۔ اگر مجامعت کی تمام اصطلاحیں ترک کرنے کے بعد بھی قبض وبست کا خیال باقی رہے تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو نہیں۔ اس جگہ تفریح قلوب مومنین کے لیے ایک واقعہ عرض کر دوں۔ ایک بزرگ جن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں بتائی جاتی تھی اُنکے آستانہ پر خود اُن کے عرس کی رات کو محفل سماع تھی۔ میں بھی حاضر تھا اور سجادہ نشیں صاحب کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ دو دیہاتی رنڈیاں دُبلی

دُبلی سیاہ فام سی کریہہ الصوت مجہول النغی اس شعر کی تکرار کر رہی تھیں ؎

لغزش مستانہ در رفتار جام مے بکف
رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بساماں دگر۔

شعر مزہ داری کا تھا۔ مگر جو لطف چاہیے تھا وہ نہ آ رہا تھا۔ اتنے میں حُکم ہوا کہ فلاں رنڈی حاضر ہو۔ حضرات۔ رات کی مدھم روشنی میں محفل کے دوسرے سرے پر ایک رنڈی بڑھی۔ جوانی۔ خوبصورتی۔ چھب تختی۔ گات گولائی۔ رنگ ڈھنگ۔ سرخ پارسی ساڑھی۔ بڑے بڑے سفید بوٹے غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ رنڈی تو گا رہی تھی میں نے صرف تحت اللفظ میں کہا "رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بساماں دگر" نہ مزا میر۔ نہ لَے۔ نہ سُر نہ مُرکی نہ بیڑا۔ نہ سوت یقین مانیئے گا میرے ارد گرد حضرات مع سجادہ نشین صاحب کے جھوم ہی تو گئے۔

میرے پڑھنے والو۔ باوجود میری "سیاہ کاریوں" کے یہ نہ سمجھئے گا کہ "قربۃ" الی اللہ کیلئے میں نے تصوف کا در نہیں کھٹکھٹایا۔ حلقہ میں بھی بیٹھا ہوں۔ بزرگوں سے عرض حال بھی کیا ہے۔ مگر جو راہ دل ڈھونڈھتا تھا وہ ملی۔ حکیم سنائی تک تو تصوف سمجھ میں آیا۔ اس سے مدد بھی ملی۔ مگر اس کے آگے نہ چلا۔ اگر تصوف سے مراد قرآن کے احکام کے اندر رہ کر وہ طریق زندگی ہے جو حضرت ابوذرؓ غفاری صحابی رسول اللہؐ کا تھا۔ جن کا ذکر مختلف کتب تاریخ اسلامی میں ملتا ہے۔ یا جناب ابو دردؓا کی زندگی تھی۔ یا حضرت سلمان کی تھی یا خود جناب امیر علیہ السلام کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی۔ تو پھر تو تصوف وہی ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویل آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مولانا روم کو نہ سمجھ سکا

مثنوی مولوی معنوی هست قرآں در زبان پہلوی

اگر ان اشعار کیلیے کہا جائے جو بربنائے آیات ہیں تو خیر۔ مگر جہاں ان روایات کی بنا پر وہ حکایتیں ہیں جن کی تدوین تیسری صدی کے شروع میں ہوئی ہو اور جن کی بابت میں اپنے ناچیز خیالات ظاہر کر چکا ہوں تو مجھ کو مثنوی کا یہ شعر اچھا نہیں معلوم ہوتا

میرے پڑھنے والو مجھ کو معاف کرنا۔ اس جگہ رسول خدا صلعم کے اصحاب خاص کے اسمائے گرامی آگئے ہیں۔ سلسلۂ کلام کو ترک کر کے آپ ہی آپ دل چاہتا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں ایک ایک بات عرض عرض کر دوں۔ تب آگے چلوں۔ رشتۂ کلام تو چھوٹا مگر عروۃ الوثقائے محبت میں ہمارے آپ کے دل اگر گندھ جائیں تو کیا بُرا ہے۔ حضرت ابو دردا اور حضرت سلمان کے درمیان میں ان کے آقا و مولیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا۔ ایکدن حضرت سلمان اپنے بھائی کو دیکھنے گئے۔ غریبی اور عسرت حضرت سلمان کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر حضرت ابو دردا کی بی بی کے پھٹے میلے کپڑے دیکھ کر رنج ہوا۔ استفسار پر حضرت ابو دردا کی بی بی نے کہا کہ تمہارے بھائی کو سوائے عبادت خدا کے اور کسی چیز سے واسطہ ہی نہیں ہے۔ رات کو حضرت ابو دردا سے حضرت سلمان نے کہا کہ بی بی کا حق بھی ہے اور اپنے نفس کا بھی اور خدا کا بھی۔ بعد کو جناب رسالتمآب صلعم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ جناب سلمان فارسی کو حضرت علی نے بصرے کا والی مقرر کیا تھا۔ راستہ میں سواری کا گدھا مر گیا تھا۔ خود اپنی پیٹھ پر زین لادے ہوئے اپنی حکومت کے شہر میں داخل ہوئے۔ حضرت اویس قرنی بکریاں چراتے تھے۔

اور دنیا کو بکریوں سے کم جانتے تھے۔ صفین میں جناب امیر کی طرف سے لڑے اور جناب خال المومنین کی فوج نے شہید کیا۔ رسول اللہ کی زیارت نہیں ہوئی تھی مگر آنحضرت صلعم فرماتے تھے کہ یمن کی طرف سے مجھ کو بوئے محبت آتی ہے۔ جناب امیرؑ فرمایا کرتے تھے کہ اے دنیا میں نے تیری مہار تیری گردن پر ڈال دی ہے۔ مجھ کو تیری پروا نہیں۔ چلی جا جدھر دل چاہے۔ حضرت ابوذر غفاری نے ہمیشہ اعلان کلمۃ الحق کیا۔ شروع میں اسی پر زدوکوب کی گئی اور آخر میں اسی پر اپنے حبیب کے دیار سے نکالے گئے۔ مگر کیا پروا۔ مارے گئے قرب خدا حاصل ہوا۔ نکالے گئے اپنے حبیب کے پاس جنت میں پہونچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ تھے مگر اپنی ذمہ داریوں کا خیال کر کے کہتے تھے "کاش میں درخت ہوتا کہ جانور مجھے چر جاتے۔ ان باتوں کے اسناد لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوری پوری روایتیں بھی نہیں لکھی ہیں۔ ان میں نہ معجزے ہیں نہ کرامتیں۔ یہ تو "جمال ہمنشیں درمن اثر کرد" والی بات ہے اور کچھ نہیں۔ خیر اب پھر سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ وہ تصوف تو میری سمجھ میں آتا ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویل آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے معتد بہ حصہ مولانا روم کا نہ سمجھ سکا۔ مثلاً مثنوی کے دوسرے دفتر میں امیر معاویہ کو شیطان کا صبح کی نماز کے لیے جگا دینا اور بڑی مشکل سے بتانا کہ اگر میں نہ جگاتا تو ؎

گر نمازت فوت می شد آں زماں   می زدے از درد دل آہ و فغاں
آں تأسف واں فغان آں نیاز   درگذشتے از دو صد رکعت نماز

اس حکایت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں مدعا یہ ہے کہ افعال تو اب الہیم وابستہ ہے اور نفس امارہ آدمی کو ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔ لیکن اس تعلیم کیلیے جو حکایت اختیار کی گئی ہے وہ اور دوسرے دود ودام کی حکایتوں کی طرح کی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کچھ فرقہ بندی کے فوائد بھی نکلتے ہیں، اسی طرح کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر کیا کروں لکھ کر، اُسکے بعد ذیل کا شعر مجھ کو تو جسارت ہی جسارت معلوم ہوتا ہے ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

قرآن کا ایک ایک حرف چاہے محکم ہو چاہے متشابہ ہر مسلمان کا ایمان ہے اور یہاں یہ ارشاد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مثنوی مولانا روم میری سمجھ سے باہر ہے۔

مورخین کا کہنا ہے کہ تصوف شروع تو ہوا عرب سے مگر پھر اس میں نو افلاطونی فلسفہ عیسائیت ویدانت سب ہی شامل ہو گئے۔ ایرانی عنصر بہت غالب ہو گیا، صوف کے معنے اگر اون کے لیے جائیں تو عیسائی پادریوں کا موٹے اون کا لبادہ پہلے سے موجود تھا۔ شادی نہ کرنا اسلام کے برخلاف عیسائی راہبوں کا شیوہ تھا۔ پیری مریدی بھی عیسائیوں کے یہاں تھی ذکر کو عیسائیت میں لٹنی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے صوفی کا لفظ جابر ابن حیان ماہر کیمیا کے لیے استعمال ہوا۔ حضرت ابراہیم ادھم کا طریقہ زہد بدھ مذہب میں موجود تھا۔ حضرت ابوذر اور حضرت سلمان اور حضرت اویس قرنی وغیرہ رضوان اللہ علیہم کا انداز دوسرا تھا۔ یہ حضرات رسول اللہ کے زمانہ میں تھے۔ جہاں غلطیاں کرتے رہے ہوں گے فوراً ٹھیک کر دیئے جاتے رہے ہوں گے۔ حضرت اویس قرنی نے زیارت نہ کی ہو مگر عاشق رسول صلعم تھے۔ اور اس وقت تک یونانی فلسفہ رائج نہیں ہوا تھا اور

کم سے کم حضرت علی علیہ السلام میں رسول اللہ کے بعد انداز پائے ہی جاتے رہے ہونگے ، مگر سلطنت چھوڑ کر فقیری لے لینا بالکل گوتم بدھ کا انداز تھا۔

حضرت بایزید بسطامی کی تعلیم فنا بھی بدھ کی نروان سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ رفاعیہ طریقہ جسمیں خود اپنے کو اذیت دینے میں بھی اسلامی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ہمہ اوست ہندوؤں کے ویدانت میں دکھائی دیتا ہے گیارھویں صدی میں حضرت ابو حامد غزالی نے کوئی راستہ ایسا نہ تھا جسکی تحقیقات نہ کی ہو۔ ان کی کتابیں یورپ میں ترجمہ ہوئیں اور صدیوں تک عیسائیوں کو متاثر کیا کیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ فقہ کا درجہ اسلام میں علم الکلام کے مقابلہ میں ضرور کم ہو گیا ہے۔ تصوف اور مضبوط ہو گیا ہے۔ میری تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہوگا اور خود میں بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ان حضرات کی کتابیں پڑھنا مجھ کو کہاں نصیب ہوئیں۔ لیکن عمر بھر پڑھا ہی کیا مختلف تاریخیں۔ مختلف سوانح جو میں نے پڑھی ہیں اُن سے یہ باتیں میرے جی میں جاگزیں ہوئی ہیں۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو وہی کتابیں پڑھ کر مجھ سے بہتر رائے قائم کرلیں۔ میں تصوف کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ مگر چار پیر چودہ خانوادے جنمیں گو ایسی ہستیوں کا نام بھی شامل کیا جاتا ہے۔ جیسے امام حسن علیہ السلام۔ مگر مجھ کو تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں نے اسلامی آسمان کے نیچے ایک اور آسمان تیار کیا ہے۔ اور جب اُن سے کہو کہ یہ آسمان تو وہ نہیں ہے جو اسلام کا کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ آسمان تو اسکے اوپر موجود ہے خالی یہاں سے دکھائی نہیں دیتا۔ جب اس طریقہ میں رہو گے اور اندر ہی

آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ اصلی آسمان بھی دیکھ لوگے۔ اسکے بعد پھر جذب اور پیر پرستی آجاتی ہے۔ جہاں اکثر نہ نماز کی ضرورت نہ روزہ کی ضرورت۔ بھنگ۔ شراب کا نجا۔ امرد پرستی سب کچھ دکھائی دیتی ہے۔ معجزے کرامات گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ تب تو حضرت ہم استغفر اللہ ربی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے۔

تصوف میں جو چیز سب سے زیادہ میرے دل پر اثر کرتی ہے وہ محبت کا ادعا اور خیالات کی نرمی اور بے ضرر ہونے کی کوشش ہے۔ کسی سے کینہ نہ رکھنے کے اصول پر تصوف کو جو ناز ہو صوفی کو درگذر سے کام لینے پر جو مباہات ہو وہ صرف بجا ہی نہیں بلکہ عش عش کرنے کی بات ہے۔ اگر کوئی کہے اسمیں صوفی کی کیا خصوصیت ہے یہ دعویٰ تو ہر مسلمان کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ میں عرض کروں گا بالکل درست ہے۔ لیکن سب طبائع ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ جسکی افتاد طبع جس طرح ہوئی وہ تعلیم سے اسی طرح کا فائدہ حاصل کرلیتا ہے طبعیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زمین کے اندر ایک دھات ہے جس سے حدت نکلا کرتی ہے۔ اور اُسکے اردگرد کی ہر چیز اپنی فطری قابلیت کے موافق اسی حدت سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ میں سائنس نہیں جانتا۔ مگر سُنی سنائی بات عرض کردوں اس دھات کا نام ریڈیم ہے۔ فرض کیجئے کہ جو پتھر اس ریڈیم کے قریب ہے وہ اپنی ماہیت کے موافق رنگ شفافی اور وزن قبول کرلیتے ہوں۔ اسی طرح ذات بابرکات رسالت صلعم کو سمجھ لیجئے کہ آنحضرتؐ کی صحبت سے ہر شخص اپنی استعداد کے موافق متاثر ہوا۔ اب قرآن کے احکام کو لیجئے۔ جو دانت توڑے اس کا بدلہ دانت ہے اور آنکھ

چھوڑے اس کا بدلا آنکھ ہے۔ اور ہر زخم کا بدلہ زخم ہے اور اگر معاف کردو تو بہتر ہے۔ قصاص کے لیے قرض کے لیے مہر وغیرہ کے لیے۔ عورتوں سے سلوک کے لیے اسی قسم کے احکام ہیں کہ تم اپنا حق لے سکتے ہو لیکن اگر درگذر کردو تو بہتر ہے۔ اب ان احکام سے ہر شخص مستفید ہوا۔ کسی نے بدلہ لینا اپنا حق سمجھا اور کسی نے درگذر کرنا اپنی طبیعت کے موافق پایا جن لوگوں کو بجائے بدلہ لینے کے درگذر کرنا زیادہ پسند ہوا وہی صوفی کہلائے۔ ایران کے تمدن سے دنیائے اسلام بہت متاثر ہوئی۔ وہاں کی شاعری میں تصوف کا رنگ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ تصوف سے واسطہ رکھتے تھے وہ متاثر ہوئے۔ اور جو واسطہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ سچے صوفی شعراء اور نام نہاد صوفی شعراء سب کے کلام میں وہی نرمی ظاہر ہونے لگی۔ کچھ مثالیں بھی آگے چل کر لکھ دونگا۔

اصحاب صفہ وہ لوگ تھے جن کا کھانا رسول اللہ صلعم سے متعلق تھا۔ کبھی آنحضرت اُن کیلیے کھانا مانگ لاتے تھے۔ کبھی لوگ خود دے جاتے تھے۔ یہ لوگ سوائے عبادت کے اور جہاد کے اور چیزوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ لفظ صوفی اسی لفظ سے نکلا۔ یا کسی دوسرے لفظ سے مطلب سے مطلب ہے۔ یعنی ان حضرات میں ایک نرمی تھی جو ہر حال قابل رشک اور غبطہ ہے۔ لیجیے کچھ اشعار سن لیجیے۔

نہ دل میں بدی ہو نہ کینہ نہ بیر　　یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کفر است در طریقۂ ما کینہ داشتن   آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن
بریں عشق ز کونین صلح کل کردیم   تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا   اور درویش کی صدا کیا ہے
جی میں جو آئے کیجو پیارے   ایک ہو نا نہ در پے آزار

ٹھیک ہر مصرع کا مضموں قافیہ گو سخت
ہے
اہل دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کمبخت
ہے

ادائے حق محبت عنایت است ز دوست
وگرنہ خاطر عاشق بہ ہیچ خورسند است

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

با خلق خدا سخن بشیرینی کن   اظہار نیاز و عجز و مسکینی کن
تا بر سر دیدہ جا دہندت مردم   چوں مردم دیدہ ترک خود بینی کن

نماز میں جہاں تک فرائض کا تعلق ہے میں سنیوں کی نماز اور شیعوں کی نماز میں کوئی ایسا فرق نہیں پاتا کہ ساتھ پڑھنے میں نماز ہی نہ ہو۔ حنفی مسائل اور شیعوں کے مسائل میں فرق ضرور ہے۔ مثلاً حنفیوں کے یہاں یہ ہے کہ اگر ایک سجدہ چھوٹ جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی بلکہ ناقص ہو جائے گی۔ شیعوں کے یہاں سجدہ رکن نماز ہے۔ اگر وہ چھوٹ گیا تو نماز ہی گئی۔

میں اس مسئلہ میں شیعوں کے مسئلہ کا قائل ہوں۔ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں جس دن امام سے ایک سجدہ چھوٹ جائیگا اس دن وہ نماز میں پھر سے پڑھ لوں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) دوسری رکعت میں شیعہ ہاتھ اٹھا کر

قنوت پڑھتے ہیں۔ میں جب سنیوں کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تو قنوت نہیں پڑھتا۔ کیونکہ میرے خیال میں قنوت نہ پڑھنے سے صرف ایک مستحب چھوٹ جاتا ہے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے اٹھ کر بیٹھے بغیر سیدھا کھڑا بھی ہو جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قعود کا حکم دوسری اور چوتھی رکعت میں بیٹھنے سے پورا ہو گیا۔ حالانکہ ان دونوں معاملات میں شیعوں کے موافق احادیث صحیح بخاری تک میں موجود ہیں۔ مگر خیر۔ یہ کتاب مناظرہ کے اوپر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اسلام میں افتراق کا ماتم کر رہا ہوں۔ “واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا” کی آیت پڑھ پڑھ کر اپنے دل کی تقویت بہم پہنچا رہا ہوں۔

سنیئے حضرات۔ نماز وغیرہ کے مسائل میں جہاں سنی شیعہ کا اختلاف ہے وہاں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی بات کے مقابلہ میں جناب سیدہ۔ علی اور حسنین روحی لہم الفداء ہی کی باتوں پر عمل کرونگا ان حضرات کے اچھے ہونے میں شک نہیں۔ مگر یہ لوگ الطہر الطاہر البحر الزاخر العلم الظاہر المنصور المؤید۔ مولانا و سیدنا محمد ابن عبداللہ رسول اللہ خیر خلقہ و اشرف بریہ روحی لہم الفداء صلی اللہ علیہ و آلہ الاطہار و علی اصحابہ الاخیار کے گود کے پالے نہیں تھے۔ جب میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں تو اس شرع پر کہاں چل سکتا ہوں جسکی تدوین حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کی ہو۔

نواں باب ۹

میرے پڑھنے والو۔ ایک تھے ہارون موسی اور ایک تھے ہارون محمدؐ۔ ہارون موسیٰ نے تفرقہ بچایا اور ہارون محمدؐ نے بھی مدۃ العمر تفرقہ بچایا۔ اور گو دفاع کی لڑائیاں اُن کو بھی لڑنا پڑیں مگر کوئی دشمن بھی یہ نہ کہہ سکا کہ علی نے کبھی آگی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ایک ہونے کی آرزو رکھتا ہوں اور جہاں تک ہو سکا ہے عملاً بھی اسی پر کاربند رہا ہوں۔ مگر عبرت کی بات ہے آج تیرہ اسٹھ برس سے ہزاروں ہزاروں کتابیں افتراق کا خلیج بڑھانے کے لیے لکھی گئیں مگر ایک بھی تحریر ایسی نہ دیکھی نہ سنی جسمیں مختلف فرق اسلام کو قریب لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ مہد سے لیکر لحد تک کچھ اس طرح کی تعلیم ہوتی ہے کہ سڑک پر چلتا ہوا مسلمان اکثر پہچان لیا جاتا ہے کہ اپنے فرقہ کا ہے یا غیر کا فاعتبروا یا اولی الابصار۔ آیتوں کی تاویل اور راویوں کی بھرمار نے قرآن کو اگر صریحاً نہیں تو معناً ضرور بدلنے کی کوشش کی ہے مگر انا لہ لحافظون فرمانے والا حفاظت کرہی رہے گا۔ ھو الذی انزل علیک الکتاب سورۂ آل عمران کے پہلے رکوع میں ہے۔ بتلاے محمد۔ اس نے تجھ پر کتاب (قرآن) اتاری ہے۔ جسمیں محکم آیتیں ہیں۔ جو اصل کتاب ہیں اور

دوسری مبہم محتمل المعنی بھی ہیں۔ لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ بڑھاتے اور تاویل کرنے کو مبہم آیتوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اسکی تاویل اللہ کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں ہے۔ اور بڑے پکے علم والے کہتے ہیں "ہم اسپر ایمان لائے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے"۔ "اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو دانش ہے"[۱] اس آیۃ میں اگر وقف "اللہ" پر رکھے جیسا کہ قرآن میں ہے یا وقف "راسخون فی العلم" پر کریئے جیسا کہ مجاہدؓ وغیرہ اور شیعہ مفسرین کہتے ہیں۔ تو خفیف سے معنے بدلجاتے ہیں۔ اگر وقف "فی العلم" پر کرو تو معنی حسب ذیل ہو جائیں گے "حالانکہ اسکی تاویل اللہ اور بڑے پکے علم والے (ائمہ) کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں۔"

اس آیۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے لئے صرف آیات محکمات ہی خدا کے سامنے باسلوب نیک پہونچانے کو کافی ہیں۔ متشابہات کے معنے سے جو واقف ہوں وہ اُن کے لیے ہے۔ متشابہات اگر صرف حروف مقطعات ہی ٹھہرائے جائیں تب تو غنیمت ہے۔ مگر محتمل المعنی آیات میں علاوہ حروف مقطعات کے اور آیتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ جیسے وضو میں، پاؤں دُھونے یا پاؤں پر مسح کرنے کی آیت ہے یا جسطرح اسی آیۃ میں وقف اللہ کے بعد کرنے پر یا وقف راسخون فی العلم کے بعد کرنے سے یا "اوحی ما اوحی"

نحو کی ان گہرائیوں تک میں نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن اتنا دیکھتا ہوں کہ اگر آیات محکمات پر ہی نظر رکھی جائے تو فرقہ بندی معدوم ہو جائے

---

[۱] دیکھو قرآن عبدابن یوسف علی کا حاشیہ۔

کسی ایک فرقہ کو مورد الزام ٹھہرانا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنے فرقے ہیں وہ بجا الفتنہ میں آلودہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر فرقہ وارانہ مناظرہ پر مدار رکھا جائے تو بجائے حق ہونے کے ڈر ہے کہ دو ایک فرقہ اور بڑھ جائیں تو تعجب نہیں۔ سیدھے سیدھے احکام جو کلام پاک میں ہیں وہی ہماری زندگی کو با اسلوب نیک پار کر دینے کو کافی ہیں۔ بشرطیکہ توفیق خدا شامل حال ہو۔ جیسا کہ میں ایک دوسری جگہ عرض کر چکا ہوں۔ تولنے میں ڈنڈی نہ مارو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ کافر اور مسلمان کے درمیان میں بھی فیصلہ کرنے میں انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ پڑوسی کے حقوق برقرار رکھو۔ لڑو۔ صلح کرو۔ معاف کر دو۔ سخاوت کرو۔ اسراف نہ کرو۔ نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ ہر بڑے گناہ سے بچتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں انشاء اللہ تعالیٰ خدا معاف کر دے گا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن شریف کی گہرائیوں کا پایا جانا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ آپ محکمات پر عمل پیرا رہیں۔ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھتے رہیں تو کچھ گہرائیاں بھی معلوم ہو جائیں تو تعجب نہیں۔ آپ نے گلستاں بچپن میں پڑھی تھی۔ آج دنیا کے تجربہ کے بعد پھر اسی کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اب سمجھ میں زیادہ آتا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کو پڑھتے رہیے۔ دیکھیے پردے کے بعد پردے اُٹھتے جاتے ہیں کہ نہیں قرآن شریف کے لفظوں سے ممکن ہے یہی مطلب ہو جیسا کہ عبداللہ بن یوسف علی وغیرہ کہتے ہیں۔ اگر اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہو جیسا کہ مولانا روم کہتے ہیں یعنی قرآن کے سات بطون تھا) اور جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے یا ان کے شاگردان۔ اہل صوفیہ کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے واللہ جسکو چاہتا ہے عطا

فرماتا ہے۔) تو ہم اس سے انکار نہیں کرتے۔ مگر ہم ایسے دنیاداروں کیلئے یہی کافی ہے جو محکمات میں ہے۔ ہمارے ایسے جاہل کا مشورہ کیا۔ مگر ہزار بات کی ایک بات عرض کردوں۔ قرآن پڑھتے جائیے۔ سب مسائل آپ ہی حل ہوتے چلے جائیں گے۔ صرف ایک بات اور عرض کردینے کو دل چاہتا ہے۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ ہم "بطون" والی بات سمجھ گئے ہیں یا فلاں بزرگ سمجھ گئے ہیں اور ہم کو بتا گئے ہیں تو آپ ذیل کی آیۃ کی فوراً تلاوت[1] شروع کردیجئے۔ "اپنے غیب پر وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔" مگر ہمارے علما تو کھلی کھلی آیتوں کے وہ معنے بیان فرماتے ہیں کہ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور آدمی دنگ رہ جاتا ہے ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
گر چاہیں تو قرآں کو بنادیں ابھی پاژند

"والذین معہ اشداء علی الکفار" کی مزے دار تفسیر کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ ارے مجھ سے تو دبی زبان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ "بلغ ما انزل علیک" کے آخر میں "فی علی" تھا۔ جس قرآن کے لیے کہا گیا ہو۔ "انا لہ لحافظون"۔ جس قرآن کی ذمہ داری اپنی خلافت ظاہری میں جناب امیر علیہ السلام نے قبول کرلی ہو اسمیں "فی علی" جوڑنا۔ یہ منطق داں ہی کرسکتا ہے۔ یہ دلیل کہ ان کے خود کے معاملہ میں "فی علی"[2] اترا تھا اسلیے وہ "طرح دے گئے یعنی امامت کو جو اصول دین میں شمار ہوتی ہے اور جو خدا کے یہاں سے جزو ایمان مقرر ہوچکا ہے اسمیں جناب امیر علیہ السلام

---

[1] سورہ جن، آیۃ ۲۶، ۲۷ عٰلم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہ احداً ۝ الا من ارتضیٰ من رسول وانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً ۝

[2] تجرید البخاری: حصہ دوم۔ روایت ۵۵۵

نے نعوذ باللہ کمی کی اور دین خدا کو ازراہ انکسار ناقص چھوڑ دیا تو یہ تو ایسی بات ہوئی کہ نبی صلعم درود کا حکم جہاں ان کا نام ہے ازراہ انکسار چھوڑ جاتے۔ یہ وارث علوم نبوی کے لیے میرے وہم میں بھی نہیں آ سکتا۔ میرے علی تو یہ نہ کر سکتے تھے۔ جس علی کو آیۂ مباہلہ میں انفسنا کا لقب عنایت ہو۔ جو روزہ رکھ کر اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور اسیر کو اپنا کھانا دیدے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی اور روحانی بھائی قرار دیا جاے۔ جو فقراء کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔ وہ قرآن کو مصلحتاً ناقص چھوڑ جائے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ شیخ صدوق[1] علیہ الرحمۃ جیسا متبحر عالم۔ وہ بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ فلاں چیز موجودہ قرآن پاک سے نکال ڈالی گئی ہے۔

تعزیہ داری کے اوپر میں افراط گریہ کے دیباچہ میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اس قدر پھر سے عرض کر دوں کہ تعزیہ رکھنا صرف ہندوستان ہی میں رواج پایا۔ حالانکہ عزائے حسین سب ملکوں میں رائج ہے۔ اسکی وجہ سوائے اسکے اور کیا بتائی جائے کہ ہماری نانیاں دادیاں جو ہندو طینت کی بی بیاں تھیں ان کی طبیعت کو اس سے مناسبت تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بت پرستی ہے اور نہ کوئی مسلمان

---

[1] ترجمہ خصال شیخ صدوقؒ صفحہ ۱۰۲، جلد ۲۔ آنچہ بے تردید میتوان گفت اینست کہ قرآن را کہ علیؑ جمع و تنظیم کرد، بہا روش درست پیغمبر با نزول بود و سے در اثر اختلاف مردم بہ کنار زدن آنحضرت از مقام خلافت مورد عمل مسلمانان واقع نشد، و چون مردم از قبول آن دریغ کردند آن را در خاندان خود بامانت سپردند تا قائم آل محمد آن را اظہار رساند۔ و آیا اختلاف آں با قرآن کہ بعداً خلفاء وقت جمع آوری کردند و بخط عثمانؓ تحریر شد تا چہ اندازہ است درست معلوم نیست۔

تعزیہ کو پوجتا ہے۔ لیکن جو اہتمام اور احترام تعزیہ کا ہوتا ہے اسمیں شاید کچھ جنون سی اسکی آجاتی ہے میرے بچپن میں عام طور سے دیکھا جاتا تھا کہ مجتہدین کے گھروں میں تعزیہ داری کا رواج کم تھا۔ انھیں شرعی احتیاطوں کی وجہ سے علار سوز بھی نہیں سنتے تھے جو کم و بیش آج تک باقی ہے۔

دسواں باب ۱۰

جو کچھ مجھ کو اپنے بارے میں اعترافات کرنے تھے کر چکا۔ سب سوئیاں نکل گئیں صرف آنکھوں کی رہ گئیں۔ یعنی متعہ کا مسئلہ۔ یہ مسئلہ جیسا ہو لیکن اغیار نے اپنی دشمنی اور ماننے والوں نے اپنی دوستی میں اسکو بدنام ضرور کر دیا ہے۔ صحاح ستہ میں اکثر روایتوں میں اسکی اجازت اور اکثر روک دیئے جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ جہاد میں آنحضرت صلعم نے روکا اور پھر ہمکو کسی عورت سے کپڑے وغیرہ کے عوض ایک مدت معینہ تک متعہ کرنے کی اجازت دیدی۔ جابر ابن عبداللہ انصاری اور سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے پاس آکر ارشاد فرمایا کہ تمھیں متعہ کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ تم متعہ کرلو۔ پھر حضرت علی سے روایت ہے کہ خیبر کے دن رسول خدا نے نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ سعید الخدری سے مروی ہے کہ ہم رسول خدا کے ہمراہ جنگ بنی مصطلق (غزوہ مریسیع میں) نکلے تو ہم کو

---

۵۱ تجرید البخاری۔ حصہ دوم روایت ۵۵۵

۵۲ ، ، ، ، ۶۵۹

عرب کی لونڈیاں ہاتھ لگیں۔ اور ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی۔ مجرد رہنا ناگوار گذرا۔ تو ہم نے عزل کرنا چاہا اور عزل کا ارادہ کر لیا۔ پھر ہم نے سوچا۔ جب رسول خداؐ موجود ہیں تو پھر بے آپ سے پوچھے کیوں عزل کریں۔ چنانچہ ہم نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا عزل کرنے میں (صرف مباشرت کے لیے) تم پر کچھ خوف نہیں ہے۔ کوئی جان پیدا ہونیوالی قیامت تک بن پیدا ہوئے نہ رہیگی۔

حضرت عمرؓ نے اسکو ہمیشہ کیلیے روک دیا ہے۔ میرے سوال پر میرے مرشد مولانا کرامت حسین اعلی اللہ مقامہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کسی شخص کی حالت لام پر کے سپاہی کی سی ہو یعنی وہ گھر سے دور ہو تو وہ متعہ کر سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ گھر بیٹھے گنگا لا کرے۔ میرے غریب خانہ پر ایک شیعہ مولوی صاحب اسکے اوپر بحث کر رہے تھے۔ صحبت کچھ گرم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے بڑی ترکیبوں سے ایک سُنی مولوی صاحب کو ہم لوگ گھیر لائے۔ دونوں حضرات ایک ہی آیۃ "فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن فريضة"٥ (شروع والمحصنات۔) (اور "جن عورتوں سے لطف اٹھا چکے ہو اُن کے مہر مقررہ دے ڈالو۔") سے جواز اور ناجوازی کی بحث فرما رہے تھے۔ علاوہ ان دو حضرات کے صحبت میں دو تین ہمارے ایسے مغرب زدہ لوگ بھی تھے جو درمیان درمیان بحث کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لیے مباحثہ میں پھاند پڑتے تھے۔

---

[1] بخاری حصہ دوم روایت نمبر ۱۰۴

[2] " " " ۱۵۴

[3] ترجمہ از مولوی صدیق حسن خان صاحب (حضرت عمرؓ اول کسے است کہ امر بہ ممانعت کرد حرام گردید متعہ)

آخر کار دونوں حضرات کو مان لینا پڑا کہ اس آیت سے متعہ کا جواز اور
ناجوازی کچھ نہیں نکلتی۔ اور بحث اس پر ملتوی ہوئی کہ آئندہ یہ دیکھا
جائیگا کہ جو چیزیں پہلے سے چلی آتی تھیں وہ اسلام میں بلا حکم تحریم جائز
رہیں یا ناجائز ہو گئیں۔ پھر دوسری صحبت کی نوبت ہی نہ آئی لیکن
صبح ہی سے پھر وہ دونوں حضرات اپنے پرانے عقیدے پر جم گئے۔
میں بھی اپنے استاد اعلی اللہ مقامہ کی رائے پر مستقل رہا اور آج تک
ہوں۔ یورپ اور امریکہ کے ممالک جو عقل و تحقیق پر نازاں ہیں ان کو
ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ملک اپنے قانون نکاح و طلاق روز بدلا کرتا ہے تقریباً
امریکہ کے ہر صوبہ میں نکاح اور طلاق کا قانون مختلف ہے۔ یورپ میں
بھی روز بروز بدلا جاتا ہے اور کوشش سب کی یہی ہے کہ کچھ ایسی
چول بیٹھ جائے کہ یہ قانون اسقدر فطرت کے موافق ہو جائے جیسا اسلامی
قانون ہے۔ گو منہ سے نہیں کہتے مگر مطلب یہی نکلتا ہے۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ دنیا میں اکثر لوگ فطرۃً ایک شریک زندگی
سے زیادہ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور فطرت سے بغاوت کرکے کوئی
آجتک کامیاب نہیں ہوا ہے پھر اس سے کیا فائدہ کہ قانون نکاح کو ایک تک
محدود کر دو۔ اور اپنے اختیارات وسیع کر دو۔ قانون ایسا کیوں نہ بنے
جسکے برتنے میں زیادہ لطف ہو اور توڑنے میں کم۔ متعہ میں یہی بات
ہے۔ اگر نیک نیتی کے ساتھ متعہ کا رواج ہو اور یہ تحقیر کی نظر سے نہ
دیکھا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو! آشنائیاں کم
ہو جائیں۔ اخلاق بہتر ہو جائیں۔ یہ میرا کہنا نہیں ہے یہ بڑے بڑوں کا قول ہے۔
عارضی اور دوامی عقد میں گو فرق ہے۔ مگر پھر بھی یورپ اور

امریکہ کے اقدام اصول متعہ کو ممکن ہے مضبوط ہی کرتے ہوں۔ متعہ کیلئے عفت کے ویسے ہی شرائط ہیں جو نکاح کے ہیں یعنے فاحشہ یا پیشہ ور کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ سورۂ[1] نور کی تیسری آیت صاف حکم دیتی ہے۔ متعہ میں عدت کی بھی شرط ہے۔ گو عدت کی مدت کم ہے۔ متعہ کی اولاد ترکہ کی ویسی ہی حقدار ہے جیسے نکاح کی اولاد۔ اگر مسلمان برخلاف اور اختلافی مسائل کے اسی مسئلہ میں اعتدال سے کام لیتے تو اسمیں کوئی شک نہیں کہ حرام اور حرامی لڑکے کم ہو جاتے۔ نکاح کے اصول ہر ملک میں مختلف ہیں اور جو لڑکے ان قاعدوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان کو ذلت اور تحقیر کی نگاہ سے کوئی دوسرے ملک والے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حرامی لڑکا ویسے ہی پیدا ہوتا ہے جیسے حلالی۔ صرف ملکی قواعد کے باہر جو لڑکے پیدا ہوتے ہیں ان کے ماں باپ کے نفسیاتی اثرات اور خود بچہ کے نفسیاتی اثرات لڑکے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں آپکی نفر خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ موضوع اتنا دلچسپ ہے کہ جسکے ذکر سے چہرے بحال اور دانت چمک دکھانے لگتے ہیں۔ اور اسقدر مختصر کر دیا جائے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ مگر میں تو صرف اپنے عقائد لکھ رہا ہوں۔ آج کی آزاد خیالی۔ آج کی آزمائشی شادی کا نظریہ آج کے ضبط تولید کے مسائل پر نظر کرتے ہوئے میں تو کہتا ہوں کہ قیاس سے کام لیکر یہ مسئلہ اگر نہ بھی ہوتا تو کچھ قیود لگا کر جائز کر دیا جاتا تو اچھا تھا۔ جو فرقہ متعہ پر اعتراض فرماتے ہیں ان کو ذری لونڈیوں کے مسئلہ پر بھی

---

[1] الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک وحرم ذالک علی المؤمنین ۝ سورۂ نور

غور کر لینا چاہیے۔ گرہ کھائیں اور گنگوں سے پرہیز تو کچھ ٹھیک نہیں۔ ضبط تولید کے لیے آلات استعمال کرنے میں اگر کسی کو احتیاط ہو تو اس سے حفاظت کی فطری دریافتیں بھی موجود ہیں۔ جسمیں مواخذہ یا ظلم کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر کون کرے۔ ہم کو اختلاف میں مزہ زیادہ آتا ہے اور دو دلوں کے ملانے میں کم۔

گیارھواں باب

اب صرف ایک بات اور رہ گئی ہے۔ یعنی بارھویں امام علیہ السلام کی غیبت۔ مسئلہ امامت یوں تو شیعوں میں اصول دین کہہ کر سکھایا جاتا ہے لیکن اسکے اصول مذہب ہونے میں کسی شیعہ کو کلام نہیں ہے۔ مجھ کو بدقسمتی سے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے شیعہ بھائیوں کو میری اس تحریر سے تکلیف ہوگی۔ مگر کیا کروں۔ بغیر کہے بھی چارہ نہیں۔ سنہ ۲۶۰ھ میں جناب امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی اور امام مہدیؑ آخر الزمان کا سن اسوقت چار پانچ برس کا بتایا جاتا ہے۔ سنہ ۲۶۳ھ میں غیبت ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ کچھ دن غیبت صغریٰ رہی اور اسکے بعد غیبت کبریٰ ہوئی۔ جو آج تک ہے اور جناب صاحب الامر علیہ السلام قیامت کے قریب ظہور فرمائیں گے۔ اس طرح کے عقیدے اکثر مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ سامی اور آریائی دونوں قسم کے مذاہب

میں جسطرح خدا کو ماننا فطرت ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کلام پاک میں ہے[۱]۔ اسی طرح دنیا بہ امید قائم ہے۔ ایک ایسے شخص کے آنے کی امید جو دنیا کو بہتر بنا دے انسانی تقاضا ہے۔ یہاں تک کہ جو خدا کو نہیں مانتے وہ بھی کہتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ہر شخص جو اچھا کام کریگا وہ خوش رہے گا اور جو گناہ کرے گا تکلیف میں ہو جائیگا۔ اس زمانہ کو وہ لوگ ملینیم (MILLINIUM) کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کو رکھنے میں دل کو ایک تسکین سی ہوتی ہے اور ظاہرا کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ مگر قرآن شریف میں کوئی نص صریح علیت کی بابت نہیں ملتی۔ تاویلیں کرکے تو بقول اقبال کے قرآن کو عیاذاً باللہ پا زند بنا سکتے ہیں۔ (جملہ معترضہ کے طور پر عرض کردوں کہ قرآن پاک کی تاویل کا میں منکر نہیں ہوں، لیکن صرف حدود کے اندر رہ کر۔ ورنہ تاویل جس سے بہتر ٹکڑے مذہب کے ہو گئے ہیں وہ ظاہر ہی ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارھویں امام علیہ السلام سامرہ کے ایک غار میں چلے گئے۔ اور پھر انکی زیارت نہیں ہوئی۔ یا صرف خاص آدمیوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوئی۔ شیعوں کو رسول اللہؐ کے بعد کچھ زیادہ آرام نہیں ملا۔ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت ظاہری اور امام حسن علیہ السلام کا مختصر زمانہ خلافت بھی لڑائیوں کی بے اطمینانیوں ہی میں کٹا۔ اس کے بعد کربلا نے ہر امید کا خاتمہ کر دیا۔ سوائے خدا کی ذات کے اور عقیدت ایمان کے تقریباً کچھ نہ رہ گیا۔ امام رضا علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ سانس لینے کا وقفہ ملا ہو گا۔ مگر وہ کے دن۔ لیکن ان لوگوں

---

[۱] ستارے اور چاند سورج سے خدا کی طرف یقین۔

نے اپنا عقیدہ برقرار رکھا۔ ان ائمہ کا علم و فضل البتہ باقی رہا۔ جب لوگ
مختلف مباحث کرتے تھے اور کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے تب بھی دل کو
تسکین نہ ہوتی تھی جبتک علمائے اہلبیت سے بھی پوچھ نہ لیتے تھے۔ امام
علی نقی علیہ السلام کے وقت میں زمین کربلا پر زراعت کرنے
اور انہدام کا حکم ہوگیا۔ ہر طرح کے مصائب شیعوں نے جھیلے مگر
اپنے ائمہ کا دامن نہ چھوڑا۔ آخر کار وہ وقت بھی سر پہ آیا۔ جب
امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی۔ بعض روایات کے موافق
ایک پانچ برس کا بچہ رہ گیا۔ بڑے گھروں کا قاعدہ ہے کہ بچہ بھی بچپنے سے
باتیں سن سن کر دیکھ دیکھ کر وہی انداز اختیار کر لیتے ہیں جو ان کے
بزرگوں کا ہوتا ہے۔ خصوصاً مصیبت میں اکثر بیمار بچوں کو دیکھ لیجیے
پیاس وغیرہ کے جھیلنے میں تکلیف کی وجہ سے تین مہینہ کا بچہ آنکھیں چار
کرنے لگتا ہے۔ چہ جائیکہ رسالت کے گھرانے کا بچہ۔ امیر علی مرحوم نے
اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس گھر کے عقیدت مندوں کو یہ بچہ ڈوبتے کو تنکے
کا سہارا تھا۔ جس کے آگے یا جس کی موجودگی میں یہ لوگ اپنے والی
وارث ہونے کا اور اپنے مصائب کا ذکر کرتے رہے ہونگے۔ اور وہ بچہ
قدرۃً متاثر ہوتا رہا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ قصہ بھی ختم ہوگیا۔ واضح ہو
کہ میں نے امیر علی کی کتاب نہ معلوم کب پڑھی تھی۔ لہٰذا اس بیان کو
میرا بیان تصور کیجیے۔ بہتر رائے قائم کرنیکے لیے

پڑھ لیجیے۔ ڈھونڈھنے والوں نے اتنا پتہ بتایا ہے کہ اس غار کے قریب تک
دیکھے گئے تھے۔ اصلیت کیا تھی۔ یہ خدا ہی جانتا ہے۔ دنیا میں یہ ہوتا چلا
آیا ہے۔ آج بھی مختلف ممالک میں ہوا ہے کہ لوگ اپنے سردار کو

کھو کر بھی یہ نہیں کہنا چاہتے تھے کہ وہ بے آسرا ہو گئے۔ دنیا بہ امید قائم۔ وہ اپنے دل کو یہی اطمینان دلایا کرتے ہیں کہ ہمارا سردار ہمارے سر پہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ لڑائی میں مارا نہیں گیا بلکہ یروشلم کی زیارت کو گیا ہے کوئی کہتا ہے کہ جہاز ڈوب گیا مگر وہ بچ گیا۔ خود عرب میں اگر عقیدہ کی بنا پر نہیں تو پالٹکس کی بنا پر یہ بات اسلام میں بہت بار آچکی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک جرمن مستشرق جن کا نام ایچ دان ہیلمٹ ریٹر ہے انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "فرق الشیعہ" اس کتاب کے مؤلف ہیں ابی محمد حسن ابن موسی النوبختی۔ یہ موسی النوبختی آخر تیسری صدی ہجری میں تھے۔ یعنی ممکن ہے انھوں نے امام حسن عسکری کا زمانہ دیکھا ہو۔ اس پر دیباچہ لکھا ہے۔ مولانا ہبت الدین شہرستانی الحسینی نے۔ یہ بزرگ یقیناً حیات ہیں اور حکومت عراق میں سابق وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں۔ اور چیف جسٹس بھی۔ یہ شیعہ ہیں اور مجتہد بھی۔ موسی النوبختی کا ذکر ابن ندیم کی الفہرست اور دوسری کتابوں میں بھی ہے ایک جزو کا ترجمہ میں نے ایک ایسے آدمی سے کروایا ہے جس کے اوپر مجھ کو پورا بھروسہ ہے۔ یہ صاحب بچپن میں میرے شاگرد تھے اور اب ماشاء اللہ میرے استاد ہیں۔ اور مجتہد ہیں۔ ترجمہ لفظی بالکل نہیں ہے بلکہ عبارت کا خلاصہ ہے۔ میں عربی نہیں جانتا مگر تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں اس لیے خود مجھ کو اس خلاصہ پر پورا وثوق ہے۔ وہوا ہذا۔

(۱) پہلا فرقہ۔ عبد اللہ ابن سبا کا ہے۔ جس نے کہا ہے علی مرے نہیں بلکہ غائب ہیں۔ کیونکہ وہ مر نہیں سکتے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ پھر وہ ظاہر ہو کر حکومت کریں گے۔

(۲) دوسرا فرقہ کیسانیہ ہے۔ جس نے محمد ابن حنیفہ کیلئے یہی کہا اور کہا کہ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جبل رضوی پر مقیم ہیں اور ان کے دونوں طرف دو شیر محافظ ہیں۔ بعض نے کہا ہے داہنی طرف شیر بائیں طرف چیتا ہے۔ اور یہی وہ مہدی ہیں۔ جن کی بشارت نبی صلعم نے دی تھی

(۳) تیسرا فرقہ وہ ہے جس نے محمد حنیفہ کے بیٹے عبداللہ کو قرار دیا ہے اور قائل ہوئے کہ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں۔

(۴) ایک فرقہ نے عبداللہ ابن معاویہ کے لیے مہدیت کا دعوی کیا یہ عبداللہ ابن معاویہ ابن جعفر طیار ہیں۔ ان کو ابو مسلم نے قتل کر دیا تب دعوی شروع ہوا۔

کیسانیہ: ہی فرقہ تھا۔ جن میں سے اور فرقہ نکلے۔ جنھوں نے غلو شروع کیا۔ کسی نے ائمہ کو خدا کہا۔ کسی نے ملک کہا: اور بعض ان میں تناسخ کے بھی قائل رہے، ایک فرقہ منصوریہ ہے جو اس کا قائل تھا کہ منصور آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ یہ منصور کوفی تھے۔ اور بنی عبد قیس سے تھے۔ انھوں نے امامت کا دعویٰ امام محمد باقرؑ کے بعد کیا کہ انھوں نے اپنے کام کی تفویض مجھ کو کی ہے اور کہا کہ علی ابن ابی طالب رسول تھے اور اسی طرح امام محمد باقر تک سب ائمہ نبی تھے۔ اور اپنے لیے بھی یہی دعوی تھا جو ان کی اولاد میں چھ پشتوں تک چلنے گا اور اس کے آخر میں قائمؑ ہونگے۔ یہ گمان کرتا تھا کہ جبرئیل اُن کو وحی لیکر آتے ہیں۔ گر دکھائی نہیں دیتے۔ ابو الخطاب اسدی نے دعوی کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے اُن کو اپنا وصی مقرر کیا ہے اور اسم اعظم سکھایا ہے۔ اور پھر بڑھ کر نبوت رسالت اور ملک ہونے کا دعوی کیا ہے۔ یہ چار فرقے تھے جن میں سے ایک

فرقہ نے کہا کہ امام جعفر صادق بھی خدا ہیں اور ابو الخطاب اُن کے نبی مرسل ہیں، اور انھوں نے زنا چوری اور شراب خواری کو حلال قرار دیا تھا اور نماز روزہ اور حج سب چھوڑ دیا تھا۔ بزیغ کی نسبت بھی ایک فرقہ نے کہا ہے کہ وہ نبی اور رسول ہیں اور ان کو بھی امام جعفر صادق نے مقرر کیا ہے۔ لیکن ابو الخطاب نے اس سے انکار کیا۔ سری کے لیے بھی متذکرہ بالا دعویٰ کیا ہے۔ ایک فرقہ نے کہا کہ جعفر صادق خدا ہیں۔ وہی نور ہیں یہ اپنے اوصیا کے جسموں میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ نور جعفر میں تھا، پھر اُن سے نکل کر ابو الخطاب میں داخل ہوا اور جعفر ملائکہ میں ہو گئے پھر یہ نور ابو الخطاب سے نکل کر معمر میں داخل ہوا۔ ابو الخطاب ملک ہو گئے اور معمر خدا ہو گئے۔ ابن لبان نے لوگوں کو معمر کی طرف بلایا۔ اور کہا انھیں کے لیے نماز اور روزہ ہے۔ اور ان لوگوں کے نزدیک کوئی چیز حرام نہیں تھی۔ کیونکہ خدا نے ہمارے ہی لیے ہر چیز کو خلق کیا ہے۔ ابو لبان سے کہا گیا کہ جعفر اور ابو الخطاب تم سے برأت کرتے ہیں اور تمھارے قول سے۔ اور تم کو کافر اور شیطان کہتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ جس کو تم دیکھتے ہو اور جعفر اور ابو الخطاب سمجھتے ہو وہ اصل میں شیطان ہیں۔ جنھوں نے جعفر اور ابو الخطاب کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ لوگ تو بڑے ملک ہو گئے اور آسمان میں خدا کے پاس ہیں اور معمر زمین کا خدا ہے اور وہ مطیع ہے آسمان کے خدا کا۔ خیریہ مزدکیہ۔ زندیقہ۔ دہریہ۔ یہ سب خدا کی ربوبیت سے منکر ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا ایک نور یا روح ہے اور بدن اس کا مسکن ہے۔ شیعہ عباسیہ جن کو راوندیہ بھی کہتے ہیں ان میں سے ایک فرقہ ابو مسلم کو

امام قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ابو مسلم مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ محرمات کو انھوں نے مباح کیا ہے۔ اور تمام فرائض کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ایمان کو معرفت امام پر منحصر سمجھتے ہیں۔ امام علی نقی کا جب انتقال ہوا تو ایک فرقہ نے کہا کہ اُن کے بیٹے محمد جو پہلے انتقال کر چکے ہیں وہ امام ہیں اور زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں۔ اور دلیل یہ تھی کہ امام علی نقی نے انکو امام بنایا تھا۔ اور امام کا قول غلط نہیں ہو سکتا اور وہی قائم مہدی ہیں۔ اور بقیہ لوگوں نے امام حسن عسکری کو امام قرار دیا اور کچھ نے انکے بھائی جعفر کو۔ امام حسن عسکری علیہ السلام کا انتقال سنہ ۲۶۰ھ میں ہوا۔ اور ان کے (جنازہ) اوپر ابو موسیٰ متوکل نے نماز پڑھائی۔ ان کی امامت پانچ برس آٹھ مہینے پانچ دن رہی۔ اُن کے انتقال کے بعد ان کا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ اور اُن کا کوئی لڑکا معلوم نہ تھا اور ان کی میراث اُن کے بھائی جعفر اور ان کی ماں نے بانٹی اور یہ کنیز تھیں۔ اور اُنکا نام عسفان تھا۔ اس کے بعد چودہ فرقے ہوگئے۔ (جس کتاب سے یہ عبارت نقل ہو رہی ہے اُسکے متن میں تیرہ ہی فرقے ہیں) ایک فرقے نے کہا کہ امام حسن عسکری مرے نہیں بلکہ غائب ہوگئے۔ اور وہی قائم ہیں۔ کیونکہ ان کی اولاد نہیں ہے، اور زمین امام سے خالی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے فرقے نے کہا کہ حسن ابن علی مر گئے اور مرنے کے بعد زندہ ہوگئے اور وہی مہدی ہیں اور قائم کے یہی معنے ہیں کہ مرنے کے بعد جی اٹھے۔ تیسرے فرقہ نے کہا کہ حسن عسکری کے بعد جعفر ان کے بھائی امام ہیں اور انھیں کے لیے حسن عسکری نے وصیت کی تھی، ایک فرقہ نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ایک بیٹا تھا محمد۔ اور اُنھوں نے جتلا دیا تھا کہ وہی امام

ہیں اور وہ لاولد نہیں تھے اور کہتے تھے کہ وہ پوشیدہ ہیں۔ اور جعفر اور اپنے دوسرے دشمنوں کے خوف سے باہر نہیں آتے۔ بعض نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان کی وفات کے آٹھ مہینے کے بعد وہی امام ہے اور ان کی زندگی میں کوئی اُن کے بیٹا نہ تھا۔ جو اس کے دعویدار ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ اس لیے اگر ہوتا تو پوشیدہ نہ رہتا۔ اس دعوی کی ایک دلیل بھی دی۔ یعنی امام رضاؑ سے روایت ہے کہ عنقریب تم مبتلا کیے جاؤ گے ساتھ ایک جنین کے جو اپنی ماں کے پیٹ میں ہوگا، اور شیر خوار۔ آٹھویں فرقہ نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ہرگز کوئی بیٹا نہ تھا۔ کیونکہ ہم نے اس کا امتحان کیا اور ہر طرح کی جستجو کی مگر نہیں پایا۔ پس اگر امام حسن عسکری کے لیے یہ دعوی کیا جا سکتا ہے تو ہر میت کے لیے ایسا ہی دعوی ہو سکتا ہے جس کے کوئی ظاہر بیٹا نہ ہو۔ اور نبی کے لیے بھی ایسا ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ فرقہ یہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دو اماموں کے درمیان میں فاصلہ نہ ہو لہذا امام بعد کو پیدا ہوگا۔

نویں فرقے نے کہا ہے کہ امام حسن عسکری کا مرنا متیقن ہے اور یہ بھی متیقن ہے۔ کہ ان کے بعد کوئی امام نہیں ہوا۔ اُن کا دعوی ہے کہ امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ جو زمانہ امام اور رسول سے خالی ہو اس کو فترت کہتے ہیں۔ اور ایسے زمانے ہو چکے ہیں اور آج کل کوئی حجت نہیں ہے۔ اور خدا قائم کو آل محمد میں سے بھیجے گا۔

گیارھواں فرقہ مشتبہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں کہ بعد امام حسن عسکری کون امام ہیں۔

بارھواں فرقہ امامیہ ہے جو کہتے ہیں کہ دنیا امام سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اگر صرف دو آدمی دنیا میں ہوں تو ایک امام ہوگا۔

ان[1] واقعات کے بعد غیبت کا عقیدہ میرا نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑی دلیل اس معاملہ میں یہ دیجاتی ہے کہ ہر زمانہ میں امام نہ ہو تو قرآن کے صحیح معنے کیسے معلوم ہونگے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ”جس نے امام زمانہ کو نہ پہچانا اسکی موت جاہلیت کی ہوئی“

اب غور فرمائیے کہ دو سو چونسٹھ سال تو ائمہ علیہم السلام رہے اور گیارہ سو ساٹھ برس سے امام غائب ہیں۔ اتنے زمانہ میں اگر بجائے غائب ہونے کے امام واقعی نہ ہوتے تو کیا فرق ہو جاتا۔ غیبت اور فقدان میں صرف نام کا فرق ہے۔ ورنہ نفع نقصان تو ایک ہی ہے۔

---

[1] واضح ہو کہ نقل کرنے میں بعض فرقوں کا بیان چھوڑ دیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

گیارھواں باب

حضرات کیا کروں۔ جن چیزوں پر یقین صرف ۵۱ سیکڑا ہے اس کو سو سیکڑہ یقین کے نام سے ظاہر کرتا ہوں۔ جن چیزوں کا یقین ۴۹ سیکڑا ہے ان کو اس طرح ظاہر کرتا ہوں گویا سو سیکڑہ بے یقینی ہے۔ خود اپنے عقیدے کا یہ حال ہے اور دوسروں کو یقین کا سبق پڑھانے چلا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے مگر کیا کروں جس گروہ میں پیدا ہوا۔ جس گروہ میں پروان چڑھا ہوں اسکی محبت دل سے نہیں نکلتی ہے۔ بس کملی کو چھوڑتا ہوں مگر یہ کملی مجھ کو نہیں چھوڑتی۔ اس طرح کی باتیں جب سنتا ہوں دل پر ایک اذیت کی عجیب کیفیت گذرتی ہے۔ خلافت کے معاملہ میں شیعوں کا مقدمہ ایسا اچھا تھا مگر خود شیعہ حضرات نے اسکو خراب کر دیا۔ اگر خلافت من اللہ۔ تبرا۔ اور غیبت امام کو نکال ڈالتے تو آج بھی شیعوں کا مقدمہ عدالت عقل و انصاف کے سامنے کمزور نہیں ہے۔ اگر حضرات شیعہ عزاداری کو حدود کے اندر رکھیں تو آج بھی ،، واعتصموا بحبل اللہ ،، تمام اہل اسلام کو طاقتور کر دے۔

بے دولتی از نفاق خیزد
قوت ہمہ زاتفاق خیزد

اسمیں کلام نہیں کہ واقعۂ کربلا وہ عظیم مصیبت ہے جس کا اثر نہ مٹ سکا

ہے اور نہ شانا چاہیے۔ یہ وہ مصیبت ہے جس کو سن کر انسان کیا پتھر بھی پسیج جائے۔ بزرگوں کے کارنامے بھی بھولنا چاہیے۔ کیونکہ انسان تاریخ ہی پڑھ کر انسان ہوتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ع

"تم بزم ادراک حقائق ہے"

مگر اس کو اس طرح کرنا کہ اس سے کینہ بڑھے۔ اس امام ہمام کی تاسی تو نہ ہوئی۔ جس نے کربلا اور شام کے سفر کے بعد نفوذ بلاد اسلامیہ کی خلافت کی دعا مانگی۔ اس پیغمبر کی تاسی تو نہ ہوئی جس نے ابوسفیان اور ہندہ جگر خوار کا اسلام قبول فرمایا۔ "اللھم صل علی محمد و آل محمد"

مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرکے سیاسی پہلو سے بھی دیکھیے تو سیاست میں حکمت عملی ہوتی ہے۔ اور سیاست نیک نیتی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے رسول اللہ صلعم کی تھی۔ سیاست کے لیے کہا جاتا ہے کہ سیاست نہ دوست رکھتی ہے نہ دشمن بناتی ہے۔ اس کو اس طرح دیکھ لیجیے کہ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اسکو تاریخ کبھی بھولے گی۔ نہ جن لوگوں نے وہ حالت دیکھی ہے۔ تا زیست اُن کے زخم بھریں گے مگر ہندوستان اور پاکستان اگر اسی ہیبت کا خیال تازہ رکھیں گے تو آرام کی زندگی دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوگی۔

شہدائے مذہب اور فدایان امت کا نام زندہ رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمارا حق ہے۔ ان کا ذکر کرکے۔ ان کے کارناموں کو سراہ کے اپنے پیشواؤں پر ناز کرکے اپنی انسانیت کو بلند کیجیے۔

سر دیدیا پہ بیعت فاسق نہ کی قبول
کیا بات ہے حسین تری آن بان کی

سلہ ۵ حفظ یہ صحیفہ کاملہ" یعنی "تقویۃ المسلمین"

www.taemeernews.com

اس طرح مجلسیں منعقد کیجیے۔ اس طرح سے دین کی اشاعت کیجیے
اس طرح سے حسینؑ کی تاسی کیجیے کہ دیکھنے والا یکبخت سے کہدے کہ کس کا غلام
ہے۔ اُنکی قربانیاں بیان کرکے سُنّی کو شیعہ کرلیجیے۔ وہابی کو شیعہ کرلیجیے۔ صوفی
تو آدھا شیعہ پہلے ہی سے ہے۔ عیسائی کو شیعہ کرلیجیے۔ ہندو کو شیعہ کرلیجیے
اور پھر سب کو روحانی طہارت کرواکے مسلمان کرلیجیے۔ ایسا کر دکھائیے کہ
جنت میں رسول اللہؐ امام حسینؑ سے فرمائیں۔ بیٹا تیری سعی مشکور ہوئی
اور جناب احدیت میں فتح مکہ والی دعا پھر سے پڑھیں۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ وانجز وعدہ ونصر عبدہ
واعز جندہ وھزم الاحزاب وحدہ فلہ الملک ولہ الحمد
یحیی ویمیت وھو علی کل شیء قدیر۔

صفر ۱۳۷۱ھ مۃ نومبر ۱۹۵۱ء

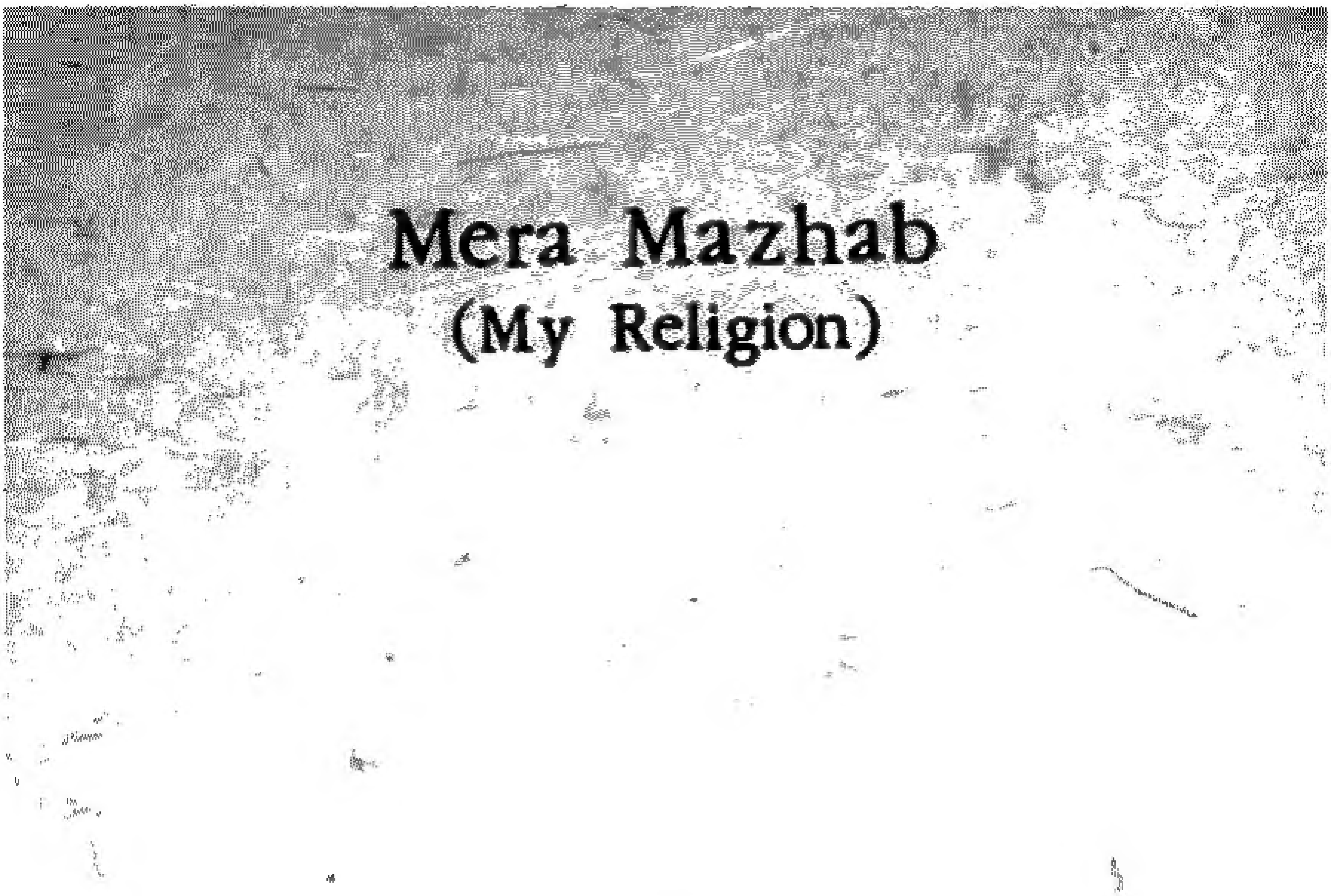

Mera Mazhab

(My Religion)

by

Muhammad Ali Rudaulwi

Urdu Research Institute
Patna